مولوی عبدالحق
بطور 'مرتب و مدون'
ڈاکٹر شازیہ عنبرین
انجمن ترقی اردو پاکستان

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان: ۵۹۲

ISBN-969-403-128-1

سال اشاعت: ۲۰۰۹ء

تعداد: پانچ سو

قیمت: =/۳۰۰ روپے

مطبع: MAFhh پرنٹرز اینڈ پبلشرز

پلاٹ 145، سیکٹر A، اسٹریٹ نمبر 10

مین کورنگی روڈ، کراچی

(دیگر سرکاری امداد یافتہ اداروں کی طرح
انجمن ترقی اردو پاکستان کو بھی اشاعت کتب کے لیے
اکادمی ادبیات پاکستان کے توسط سے امداد ملتی ہے)

مولوی عبدالحق کی مرتبہ ومدونہ کتب پر علمی اعتراضات/ اختلافات

'تحقیق' حقیقت اور سچائی کی تلاش کا ایک مسلسل عمل ہے۔ تحقیق کی دنیا میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اب تک جو دریافت ہو چکا وہی پورا سچ ہے۔ جس کو نہ تو رَد کیا جاسکتا ہے نہ تبدیل کیا جاسکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

> ''تحقیق میں 'حرفِ آخر' نہیں ہوتا کیوں کہ 'سب کچھ' کہنے کے بعد بھی 'بہت کچھ' کہنے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔'' [۱]

یہ یقین سے کہنا بے حد مشکل ہوتا ہے کہ (اصل) 'حقیقت' کتنے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ بعض اوقات پہلی نظر پورے منظر کو جزئیات سمیت عیاں کر دیتی ہے اور اکثر صورتوں میں حجابات بتدریج اُٹھتے ہیں۔ بقول رشید حسن خان:

> ''تحقیق میں ۔۔۔ نئے ماخذ سامنے آتے رہتے ہیں، نئے حقائق کا علم ہوتا رہتا ہے اور اس طرح پچھلی معلومات کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور تکذیب بھی اور اضافے بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بحث میں معتبر اور غیر معتبر کا فیصلہ اس وقت تک کی معلومات کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔'' [۲]

تحقیق موجود مواد کو مرتب کرتی ہے اس کا تجزیہ کرتی ہے اس پر تنقید کرتی ہے اور پھر اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو اہلِ علم حضرات کے سامنے رکھتی ہے۔ گویا کہ محقق کا مشاہدہ جانی ہوئی چیزوں اور موجود حقائق تک محدود رہتا ہے۔ دریافت شدہ حقائق کے آخری کنارے پر کھڑا محقق ایک حد تک ہی دیکھ پاتا ہے اور اس حد کے پار اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا کیوں کہ اُس دور کے لیے یہ تحقیق کا آخری کنارہ ہوتا ہے۔ اس کنارے کے دوسری طرف کوئی دنیا ہے یا نہیں، اس بارے میں محقق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ ایسی کوئی کوشش کرے تو وہ قیاس اور مفروضات پر مبنی ہوگی اور تحقیق مفروضات کو تسلیم نہیں کرتی۔ آزاد کے عہد کی ایک بڑی حقیقت یہ تھی کہ ''ولی اُردو شاعری کا باوا آدم ہے۔'' [۳] آزاد کا دَور اپنے عہد کے موجود وسائل اور مواد کی موجودگی میں اس حقیقت کو پورا سچ مان کر جیتا رہا کیوں کہ اُس دَور کی تحقیق کا آخری اور حتمی کنارا یہی تھا لیکن

آنے والے دور میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنی تحقیق کے ذریعے حقیقت کے رُخ سے ایک پردہ اور سرکایا اور ۱۹۲۲ء میں کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ دریافت کر کے اُردو دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ولی سے قبل بھی جنوبی ہند میں اردو کے صاحبِ دیوان شاعر موجود تھے۔[۴] اس طرح بابائے اُردو نے جنوبی اور شمالی ہند کے قدیم ترین شعری اور نثری متون کے بیش بہا مخطوطات کو جو ذاتی اور سرکاری لائبریریوں اور خانقاہوں کی الماریوں میں بند دیمک کی غذا بن رہے تھے نہ صرف دریافت کیا بلکہ تصحیح و ترتیب کے بعد شائع بھی کیا۔ اُنھوں نے دکنی ادب کے ایسے بہت سے شاعروں اور نثر نگاروں کو اہلِ اردو سے متعارف کرایا جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ [باب سوم] جن کی شعر و ادب کی تاریخ میں قدر و قیمت اور اہمیت سے مولوی صاحب کا بڑے سے بڑا مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا کیوں کہ ''انھوں نے کئی سو سال کے دفینے ہماری نظروں کے سامنے الٹ دیئے۔''[۵] اگر بابائے اُردو مذکورہ بالا قدیم متون کو شائع نہ کرتے تو اُردو تاریخ اہم ترین ماخذ سے محروم جاتی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ تحقیق کی دنیا میں کچھ بھی 'حرفِ آخر' نہیں ہوتا، جدید تحقیق کی روشنی میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی بہت سی تحقیقات کی جہاں تصدیق ہوئی وہاں بہت سی باتوں کی تردید بھی ہوئی۔ غلطیوں کی نشان دہی اور تصحیح صحت مند فعل ہے اور معاصر محققین کا اخلاقی فرض بھی۔

> ''ہر غلطی کی تصحیح اور ہر برائی کی بیخ کنی ایک فرض منصبی ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ اس غلطی یا برائی کا قد و قامت یا پھیلاؤ کم ہے یا زیادہ۔''[۶]

لیکن اغلاط کی نشان دہی کو احتساب میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔ علمی اختلافات کو شخصی اختلافات سے الگ رکھنا چاہیے اور کسی کی علمی اہلیت کو طنز و تعریض کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اغلاط کی نشان دہی میں احساسِ برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا اغلاط کی طرف ہمدردی و دل سوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو اس سے اصلاح ہوگی۔ چبھتے ہوئے الفاظ میں ۔۔۔۔ اعتراض کا مدعا خبط ہو جائے گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تحقیقی بحث میں ذاتی حملے نہ کیے جائیں۔''[۷]

لیکن بعض محققین کے نزدیک مروت اور خوش خلقی سب سے بڑی انسانی کمزوری ہے۔ غلطی معلوم ہونے کے باوجود وابستگی یا تعلقِ خاطر کے سبب غلطی کی گرفت نہیں کی جاتی یا کی بھی جاتی ہے تو بے حد نرمی سے۔ اگر طبیعت میں یہ نرمی یا چھوٹ دینے کی عادت ہے تو ایسا شخص محقق یا ناقد نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی بات کا جواب دیتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''اغلاط کی طرف ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو اس سے اصلاح ہوگی۔۔۔۔اگر کوئی اس مشورے پر عمل کرنا چاہے تو کتاب خواہ اغلاطِ فاحش سے کتنی ہی مملو کیوں نہ ہو اس پر تبصرہ کا آغاز کچھ اس طرح کرے: جناب والا کو نہایت ادب سے اطلاع دی جاتی ہے کہ جناب والا کی کتاب (نام) میں بکثرت اغلاط فاحش نظر آتے ہیں یہ تو ممکن ہی نہیں کہ جناب والا سے یہ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں کاپی یا پروف کی تصحیح کا کام جن صاحب کے سپرد ہوا ظاہراً کثرت مشاغل کی وجہ سے وہ اس کے لیے کافی وقت نہ نکال سکے۔ جناب والا اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ اس ملک میں حاسدوں کی کمی نہیں۔ وہ موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور چھاپے کی غلطیوں کو لکھنے والے کی غلطیاں قرار دینے میں اُنہیں مطلق تامل نہیں ہوتا۔ احقر کا باادب مشورہ ہے کہ آئندہ تصحیح کا کام ایسے لوگوں کے سپرد ہو جو اس کے لیے وقت نکال سکیں۔'' [۸]

عرصے سے ہماری تحقیق میں کچھ اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہو رہی ہیں مثلاً معترضانہ تحقیق، منفی تحقیق، تخریبی تحقیق، جس میں اغلاط کی نشان دہی کے لیے سخت گوئی، اعتراضات کے لیے طنز اور درشت بیانی لازم وملزوم سمجھے جانے لگے ہیں۔ ایسے محققین نے محض دوسروں کی اغلاط گیری اور عیب جوئی کو ہی اپنا موضوع بنالیا ہے۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر خلیق انجم کو کہنا پڑا کہ ''اُردو میں کچھ لوگ تحقیق کرتے ہیں اور کچھ اُن کی غلطیاں نکالتے ہیں۔'' [۹]

دوسروں کی اغلاط شماری یا تصحیح اغلاط کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا لینا ہرگز کارِ تحسین نہیں ہے۔ کسی بھی محقق کی کتاب یا مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے اُس کی اغلاط کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کو بھی دکھانا چاہیے۔ مبصر کے نزدیک وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں لیکن تصویر کے دونوں رُخ پیش کرنے چاہئیں تاکہ بات متوازن ہو سکے لیکن اگر کسی محقق کے نزدیک کوئی کتاب

ایسی ہے جو محض مجموعہ اغلاط ہی ہے جس میں کوئی خوبی نہیں تو اسے نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہوگا۔
تحقیقی غلطیوں کی درشت بیانی سے نشان دہی کرنے والوں میں قاضی عبدالودود کا نام سرفہرست ہے جو برملا کہتے ہیں کہ

"ہندوستان میں نرمی کی نہیں سختی کی ضرورت ہے بلکہ بہتوں سے طنزیہ الفاظ میں نہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں۔آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ بہتوں کا دماغ جھوٹی تعریف نے خراب کر دیا ہے۔وہ محققین کی صفِ نعال میں بیٹھنے کا حق نہیں رکھتے لیکن وہ اپنے آپ کو صفِ اولین میں ایک ممتاز جگہ کا سزاوار سمجھتے ہیں ایسے لوگ اپنی اصلاح کیا کریں گے؟ کتنے ہی نرم الفاظ میں اغلاط کی نشان دہی کیوں نہ ہو وہ معترض کے دشمن ہو جاتے ہیں۔" [۱۰]

قاضی عبدالودود نے 'معاصر' (پٹنہ) میں 'عبدالحق بحیثیت محقق' کے عنوان سے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اس سلسلے کے تین مضامین: ۱۔معاصر (پٹنہ) حصہ ۱۳، ۱۹۵۸ء ۲۔معاصر (پٹنہ)، حصہ ۱۴، جولائی ۱۹۵۹ء ۳۔معاصر (پٹنہ) حصہ ۱۵، نومبر ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے یہ مضامین کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔اس کتاب میں اُنھوں نے مولوی عبدالحق کی مرتبہ ومدونہ کتب پر سخت اعتراضات کیے اور اُن کی تحقیقی غلطیوں کی نشان دہی کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک غیر محتاط محقق تھے۔

قاضی عبدالودود کے علاوہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، نثار احمد فاروقی، کلیم الدین احمد، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی، عزیز احمد، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر اقتداء حسن، ڈاکٹر تنویر علوی، رشید حسن خان، ڈاکٹر گیان چند جین، افسر امروہوی، افسر صدیقی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر، ڈاکٹر سہیل بخاری، سید قدرت نقوی، اکبر علی خان، حبیب احمد صدیقی، عبدالرؤف عروج اور ڈاکٹر آمنہ خاتون نے بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحقیقات پر اعتراضات اُٹھائے۔ کسی کے نزدیک مولوی عبدالحق کے مزاج کو تحقیق سے مناسبت نہیں تھی، کسی کی رائے میں وہ عجلت پسند محقق واقع ہوئے تھے۔ سہل پسندی، جلد بازی اور بے توجہی ان کی تحقیق کی نمایاں خصوصیات ہیں۔
اپنے علم وفضل پر اندھا یقین رکھتے تھے۔ جو کچھ ان کی نظر میں صحیح ہوتا تھا اُسی کو ٹھیک سمجھتے تھے خواہ وہ

تحقیقی نقطۂ نظر سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اختلافِ رائے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ایک ہی نسخے کو سامنے رکھ کر متن تیار کرلیا کرتے تھے۔ ان کے مرتبہ متون اختلافِ نسخ سے عاری ہوتے تھے۔ کام انجمن کے ملازمین سے کرواتے تھے اور کتابوں پر نام ان کا چھپتا تھا۔ انھوں نے بہت سی قدیم کتابوں کے ناقص متن شائع کردیے۔ فارسی زبان پر عبور ہونے کے باوجود فارسی عبارات کو سمجھنے میں اکثر سہو کرجاتے تھے۔ شاعری سے اُنھیں کوئی مناسبت نہیں تھی۔ ان کے مرتبہ متون میں ناموزوں اشعار کی بھرمار ہے۔ وہ انجمن کے کاموں میں اس قدر مصروف رہتے تھے کہ ان کے پاس قدیم مخطوطات کی چھان بین کا وقت ہی نہیں بچتا تھا اس لیے ان کے مرتبہ متون میں غلطیوں کی کثرت ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مرتبہ متون میں آدابِ تدوین کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ سنین (مصنّفین کے سالِ پیدائش، وفات، کتابوں کے سن تصنیف) کے تعین میں انھوں نے فحش غلطیاں کیں، وغیرہ وغیرہ۔

رائے لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی کے تذکرہ 'چمنستان شعراء' کا نام تاریخی ہے جس سے بابائے اُردو نے تذکرے کا سنِ تصنیف ۱۱۷۵ھ اخذ کیا ہے جب کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شفیق اورنگ آبادی کے لکھے ہوئے قطعۂ تاریخ سے 'چمنستان شعراء' کا سنِ تصنیف ۱۱۷۶ھ نکالا ہے۔

از حضرت فیض بخش آزاد- گردید مرا تخلص انعام
تاریخ بابل بزم گفتم - ''امداد شفیق شد مرا نام''

(۱۱۷۶) [۱۱]

بابائے اُردو نے مقدمے میں واضح الفاظ میں لکھا کہ یہ تذکرہ شفیق نے اٹھارہ سال کی عمر میں لکھا [مقدمہ 'چمنستان شعراء' از مولوی عبدالحق، ص ۱۶] جب کہ ۱۱۷۵ھ کو اگر درست تسلیم کریں تو شفیق کی عمر اٹھارہ نہیں سترہ سال بنتی ہے۔ شفیق کے سالِ پیدائش کے تعین میں بھی مولوی صاحب سے سہو ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سہوِ کتابت ہو۔ ☆ انھوں نے مقدمے میں شفیق کا سالِ ولادت ۱۱۸۵ھ لکھا ہے [مقدمہ ''چمنستان شعراء'' از مولوی عبدالحق، ص ۲] جب کہ شفیق کا سالِ ولادت ۱۱۵۸ھ ہے [۱۲]۔ اس سالِ ولادت کے مطابق ۱۱۷۶ھ میں شفیق نے اٹھارہ سال کی عمر میں اپنا تذکرہ 'چمنستان شعراء' مکمل کیا۔

قائم کا تذکرہ 'مخزن نکات' بابائے اُردو نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کرکے شائع کیا۔ مطبوعہ

نسخے کا متن لیتھو اور مقدمہ ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔ مقدمے میں مولوی صاحب نے یہ وضاحت نہیں کی کہ 'مخزن نکات' کا کون سا مخطوطہ ان کے پاس تھا؟ انھیں یہ نسخہ کہاں سے دستیاب ہوا؟ یہ نسخہ قلمی تھا یا مطبوعہ تھا؟ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر اقتدا احسن نے 'مخزن نکات' کو مرتب کیا جسے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔ ڈاکٹر اقتداء حسن نے کھوج لگائی کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'مخزن نکات' کے نسخے کا تعارف اس لیے نہیں کروایا تھا کیوں کہ ان کے پاس 'مخزن نکات' کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا بلکہ 'مخزن نکات' کا اصل نسخہ ڈیوڑھی مستقیم الدولہ حیدر آباد دکن کے ایک تاجر (جو کتابوں کا کاروبار کرتا تھا) سید رستم علی کے پاس تھا۔ وہ اس تذکرے کو لیتھو میں چھپوا رہا تھا۔ تذکرے کی طباعت تقریباً مکمل ہو چکی تھی جب کسی ذریعے سے مولوی عبدالحق کو اس تذکرے کے بارے میں پتہ چلا۔ انھوں نے اس تاجر سے بات کی اور اس کو آمادہ کیا کہ وہ اس تذکرے کی اشاعت کے حقوق انجمن ترقی اُردو کو دے دے۔ چوں کہ وہ کتابوں کا تاجر تھا یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس نے تذکرے کے عوض بابائے اُردو سے کچھ رقم بھی وصول کی ہو۔ بہرحال سید رستم علی سے لیتھو میں طباعت شدہ تذکرہ 'مخزن نکات' حاصل کر کے مولوی صاحب نے اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو سے شائع کر دیا۔ 'مخزن نکات' کی مطبوعہ ڈمی اور ابتدائی پروف خلیل الرحمٰن داؤدی کے ذریعے ڈاکٹر اقتدا احسن کو دستیاب ہوئے۔ اس مطبوعہ ڈمی کے صفحہ نمبر ۸۰ پر تاجر کا نام اور اشتہار بھی چھپ چکا تھا جسے بعد میں دبیز کاغذ کے پردے میں چھپا دیا گیا۔ [۱۳]

ڈاکٹر اقتدا احسن نے 'مخزن نکات' کی تدوین کے لیے انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود 'مخزن نکات' کے خطی نسخے کو بنیاد بنایا اور چھ ایسے شعراء (علیم شاہ، محمد اعظم، میر علی تقی (نقی) کافر، قمر الدین صفت، مراد علی حیرت اور محمد شاکر) کا تعارف کرایا جن کا ذکر بابائے اُردو کے مرتبہ 'مخزن نکات' میں موجود نہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے قائم کے سال پیدائش کا تعین تو نہیں کیا البتہ قائم کا سال وفات، جرأت کے درج ذیل شعر سے ۱۲۰۸ھ متعین کیا ہے۔

جرأت نے کہی یہ رو کے تاریخ وفات
یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی کیا
کیجے اب آہ [۱۴]

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی بابائے اُردو سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اس مصرع سے ۱۲۰۸ھ ہی نکلتے ہیں اور یہی صحیح ہے، لیکن ہمیں اس مصرع سے یہ تاریخ ہاتھ نہیں آئی ۱۲۰۲ھ البتہ مستفاد ہے۔'' [۱۵]

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی یہ رائے مستند نہیں ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی 'دستور الفصاحت' کے مقدمے میں قائم کی، تاریخ وفات ۱۲۰۸ھ ہی لکھی ہے۔ [۱۶]

'مخزن نکات' کے مقدمے میں مولوی عبدالحق نے قائمؔ کی بعض غلطیوں کی نشان دہی بھی کی۔ جس میں ایک خاص غلط فہمی یہ تھی کہ قائمؔ نے 'سعدی شیرازی' کو ریختہ کا شاعر قرار دیا کہ مولوی عبدالحق کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ ان کے نزدیک قائم کو سہو ہوا ہے۔ یہ 'سعدی شیرازی' نہیں بلکہ 'سعدی دکنی' ہیں (مقدمہ 'مخزن نکات' از مولوی عبدالحق، ص ۷) جب کہ جدید تحقیق کے مطابق 'سعدی دکنی' بھی غلط ہے۔ 'مخزن نکات' میں مذکور 'سعدی' کا تعلق 'کاکوری' سے تھا اس لیے اس کو 'سعدی کاکوروی' کہنا درست ہوگا۔ [۱۷]

قائمؔ نے اپنے تذکرے کے آغاز یا اختتام میں تکمیلے کی تاریخ درج نہیں کی۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے تذکرے کے داخلی شواہد سے 'مخزن نکات' کا سن تصنیف ۱۱۶۸ھ بتایا ہے۔ مقدمے میں لکھتے ہیں: ''خواجہ اکرم نے اس تذکرے کے لیے ایک قطعہ تاریخی لکھا تھا جس میں مادۂ تاریخ 'مخزن نکات' تھا۔ قائم کو یہ مادہ پسند آیا اور تذکرے کا یہی نام رکھ دیا۔ اس سے سنہ تالیف ۱۱۶۸ھ نکلتا ہے۔'' (مقدمہ 'مخزن نکات' از مولوی عبدالحق، ص ۶)

لیکن تذکرے کے مختلف تراجم کی روشنی میں محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ 'مخزن نکات' کا آغاز ۱۱۶۸ھ سے پہلے ہو چکا تھا۔ ۱۱۶۸ھ کے بعد بھی مولف اس میں اضافہ کرتا رہا۔ مولانا امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''قائم نے پہلے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۴ء ملتی ہے۔۔۔۔ ۱۱۶۷ھ (۵۴-۱۷۵۳ء) میں احمد شاہ کے معزول ہو جانے اور عالم گیر ثانی کے تخت نشین ہونے کے بعد اس بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام 'مخزن نکات' رکھا جس

سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔ اس تاریخ کے بعد بھی اس نے جابجا
اضافے کیے جس کا سلسلہ ۱۱۷۶ھ/۶۲-۱۷۶۲ء تک جاری رہا۔'' [۱۹]

فتح علی حسینی گردیزی نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' میں ستانوے (۹۷) شعراء کا ذکر کیا [۲۰] جب کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' میں اٹھانوے (۹۸) شعراء کی فہرست اور ترجمہ پیش کیا۔ 'میر صلاح الدین پاکباز' کے ذکر کی تفہیم میں مولوی صاحب سے سہو ہوا ہے۔ انھوں نے حرف 'با' کے تحت 'قزلباش خان امید' کو شامل تذکرہ شاعروں کی فہرست میں شمار کر کے 'میر صلاح الدین پاکباز' کے اشعار کو 'قزلباش خاں امید' سے منسوب کر دیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس طرف بھی توجہ نہیں دی کہ پاکباز کے بعد قزلباش کے ذکر کا کوئی موقع نہیں تھا۔ قزلباش کا ذکر اگر آنا تھا تو تخلص کی رعایت سے ردیف 'الف' کے ساتھ آتا یا نام کی رعایت سے ردیف 'ق' کے ساتھ، لیکن مولوی صاحب اس مقام سے سرسری گزر گئے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے مولوی عبدالحق کے مرتبہ 'تذکرہ ریختہ گویاں' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراض اُٹھایا کہ انھوں نے مقدمے میں تدوین کے اصولوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، البتہ اتنا لکھا: ''یہ تذکرہ ہم نے تین مختلف قلمی نسخوں سے مرتب کیا ہے ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔'' [۲۱] باقی دو مخطوطات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس خاص نسخے کے متعلق بھی یہ نہیں بتایا کہ مدون کو وہ کہاں سے ملا تھا اور اب کہاں ہے۔ اس کا سائز کیا ہے خط تحریر کیا ہے؟ [۲۲]

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے لیے مولوی عبدالحق نے جو اختلاف نسخ مرتب کیے ان پر بھی کڑی تنقید کی ہے:

> ''اختلاف نسخ کے لیے حاشیہ 'ن' لکھا ہے لیکن اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے کہ 'ن' سے کون سا نسخہ مراد ہے۔ ترقیمہ دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ مدون نے نسخہ مذکور (مکتوبہ ۱۱۷۲ھ) کو بنیاد بنایا ہے اور باقی نسخوں سے اس کا مقابلہ (غالباً سرسری) کر لیا ہے۔ جہاں کہیں اختلاف سمجھ میں آیا ہے اس کی حاشیے میں نشان دہی کر دی ہے۔'' [۲۳]

ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے مولوی عبدالحق کے مرتبہ 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے متن میں بھی بے شمار اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ جن کی بنیادی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ

''پوری کتاب میں مشکل سے دو چار مقامات ایسے ہیں جہاں مدون کو
سوالیہ نشان (؟) بنانے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ ایسا کوئی موقع نہیں آیا
جہاں عبارت نہ پڑھی جا سکی ہو اور نقطے لگائے گئے ہوں۔'' [۲۴]

یہی وجہ ہے کہ تذکرے کے متن میں بکثرت اغلاط ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں ایسی نثری عبارتوں کی نشان دہی بھی کی جن کی تفہیم میں مولوی عبدالحق سے سہو ہوا اور ایسے اشعار کی فہرست بھی پیش کی جو ناموزوں ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''متن کی صحیح قرأت پر بھی کماحقہ توجہ صرف نہیں کی گئی۔۔۔۔ مولوی
صاحب نہ تو شعر صحیح طور پر پڑھ سکتے تھے اور نہ نثر پڑھنے کا ملکہ انھیں
حاصل تھا اور کچھ شک نہیں کہ مذکورہ اغلاط کی موجودگی میں یہی نتیجہ اخذ کیا
جا سکتا ہے۔'' [۲۵]

۱۹۶۵ء میں افسر صدیقی اور سید علی رضوی نے 'مخطوطات انجمن ترقی اُردو' مرتب کیے۔ اس کی پہلی جلد میں انھوں نے لکھا کہ مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' کا نام غلط درج کیا ہے۔ اس تذکرے کا نام دراصل 'کتاب گلشن راز' ہے [۲۶]۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' کی تدوین کرتے ہوئے جس نسخے کو بنیاد بنایا اس کے ترقیمے میں یہ وضاحت تو تھی کہ یہ تذکرہ حیدرآباد میں سید عبدالولی عزلت کی فرمائش پر ۱۱۷۲ھ میں نقل کیا گیا جس کے کاتب کا نام سید عبدالنبی تھا (مقدمہ 'تذکرہ ریختہ گویاں' از مولوی عبدالحق، ص) لیکن تذکرے کا نام کیا تھا۔ اس کی وضاحت سرورق پر تھی یا نہیں؟ اس بارے میں مقدمے میں مولوی صاحب نے کوئی وضاحت نہیں کی۔ البتہ مطبوعہ متن کے صفحے نمبر (۴) پر یہ عبارت درج ہے: ''بعد ہذا آشنایان این فن را مخفی کہ چوں تذکر ہ ریختہ گویاں است شمہ از معنی ریختہ بہ تقریب سخن در مطاوی خطبہ مذکوری گردد۔'' ('تذکرہ ریختہ گویاں'، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۴)

شاید اسی عبارت کو بنیاد بنا کر مولوی صاحب نے اس تذکرے کو 'تذکرہ ریختہ گویاں' کا نام دیا (مقدمے میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا) لیکن افسر صدیقی کے نزدیک مذکورہ بالا عبارت میں 'تذکرہ ریختہ گویاں' نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کا مقصد ریختہ کہنے والوں کا تذکرہ ظاہر کرنا ہے [۲۷]۔ اس لیے افسر صدیقی کا اصرار ہے کہ فتح علی حسینی کے اس تذکرے کا نام 'گلشن راز' ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اُردو کراچی کے کتب خانے میں اسی تذکرے کے ایک دوسرے قلمی

نسخے کا سراغ لگایا جسے 'محمد شریف عاجز' نے 'عبدالغنی' کے لیے نقل کیا تھا۔ اس نسخے کے صفحہ اول پر 'کتاب گلشن راز' یعنی تذکرہ 'بے بدل ہندی' از تصنیف فتح علی خاں اور صفحہ دوم پر 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' سے قبل تذکرہ 'بے بدل ہندی' از تصنیف فتح علی خاں تحریر ہے۔ [۲۸]

مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے مقدمے میں 'نکات الشعراء' اور 'تذکرہ ریختہ گویاں' کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جو قابل قدر کارنامہ ہے جب کہ ڈاکٹر تنویر علوی کے نزدیک یہ مباحث دو تذکروں میں موجود ہیں اس لیے انھوں نے اسے تکرار محض قرار دیا۔ [۲۹]

غلام ہمدانی مصحفی کے تین تذکرے 'عقد ثریا' (۱۱۹۹ھ) 'تذکرہ ہندی' (۱۲۰۹ھ) اور ریاض الفصحا (۱۲۳۶ھ) مولوی عبدالحق نے مرتب و مدون کیے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تینوں تذکروں کے ساتھ ایک ہی مقدمہ بغیر کسی ترمیم اور اضافے کے شامل کر دیا۔ ڈاکٹر تنویر علوی نے مروتاً لکھا کہ

"مصحفی کے سوانح و سیرت پر مولانا نے جو نظر ڈالی ہے اس میں بھی یک رنگی و یکسانیت کے پہلو موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک مقدمہ دوسرے مقدمے کی تحریر کے وقت سامنے رہا اور استفادے کی صورت نمایاں ہوتی گئی۔" [۳۰]

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک مقدمہ دوسرے مقدمے کی تحریر کے وقت بالکل سامنے نہیں رہا بلکہ تینوں تذکروں کے لیے بابائے اُردو نے ایک ہی مقدمہ لکھا۔ مصحفی کے سوانحی کوائف میں اشتراک تو فطری امر تھا لیکن فارسی شاعری اور اس کے تہذیبی محرکات و عوامل پر گفتگو اور اس عہد کی زندگی میں ہندوستانی فارسی گو شعراء کے جو تذکرے لکھے گئے تھے ان سے استفادہ بے حد ضروری تھا بلکہ مصحفی کے تذکروں کی صحیح قدر و قیمت کا تعین اس عہد کے دیگر فارسی اور اُردو تذکروں کے تقابلی مطالعہ کے بغیر ممکن نہ تھا لیکن مولوی صاحب نے اس طرف خاص توجہ نہیں دی۔

مولوی عبدالحق کے مرتبہ 'عقد ثریا' (از مصحفی) میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ مصحفی نے اس میں مذکور ایک سو سینتالیس شعراء کے صرف حالات اور ان کے کلام پر آراء لکھی تھیں لیکن نمونہ کلام صرف ایک شاعر کے علاوہ اور کسی کا درج نہیں تھا اور یہ شاعر خود مصحفی تھا۔ شعراء کے نمونہ کلام کے بغیر ان کے فن پر تنقیدی آراء بے معنی اور بے دلیل سی لگتی ہیں لیکن بابائے اُردو نے مقدمے میں یہ وضاحت نہیں کی کہ 'عقد ثریا' کا جو نسخہ ان کے پاس تھا اس میں مصحفی نے شعراء کا نمونہ کلام

درج کیا تھا یا نہیں؟

'عقد ثریا' کی تدوین مولوی عبدالحق کتب خانہ خدا بخش کے خطی نسخے کو بنیاد بنا کر کی۔ جب انھوں نے اس نسخے کی نقل قاضی عبدالودود سے منگوائی تو انھیں خاص ہدایت کی کہ 'عقد ثریا' میں مصحفی نے جو منتخب اشعار نقل کیے ہیں وہ حذف کر دیے جائیں[۳۱] لیکن مقدمے میں اس کی وضاحت نہیں کی۔ قاضی عبدالودود نے 'عقد ثریا' کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلا اعتراض بابائے اُردو کے اسی فعل پر کیا۔

''انھوں نے کسی جگہ یہ نہیں بتایا کہ عقد کے اشعار باستثنائے بعض حذف کر دیے گئے ہیں۔ مط کے پڑھنے والے یہ سمجھیں گے کہ خطی نسخوں میں بھی اتنے ہی اشعار ہیں جتنے مط میں ہیں تو یہ ان کا قصور نہ ہوگا۔''[۳۲]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مقدمے میں لکھا کہ 'تذکرہ ہندی' اصل ہے باقی دو کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔'' (مقدمہ 'عقد ثریا' از مولوی عبدالحق، ص ۱۳) قاضی عبدالودود کے نزدیک بابائے اُردو کی یہ رائے بھی صحت سے خالی ہے کیوں کہ

''ریاض (ریاض الفصحا) کو جس میں فارسی کو اور ریختہ کو دونوں شامل ہیں اور اُردو اور فارسی دونوں کے اشعار موجود ہیں عقد و تذکرہ ہندی کا تکملہ کہا جائے تو شایاں پذیرائی ہے۔ عقد کو جس کا موضوع تذکرہ ہندی سے مختلف ہے اور جو اس سے قبل وجود میں آچکا تھا اس کا تکملہ کہنا ٹھیک نہیں۔''[۳۳]

بابائے اُردو نے مصحفی کا زمانہ ولادت ۱۱۴۱ھ اور ۱۱۵۶ھ کے درمیان قرار دیا ہے جب کہ محققین نے 'ریاض الفصحا' اور مصحفی کے دیوان ششم کے حوالے سے مصحفی کا سال پیدائش ۱۱۶۱ھ قرار دیا ہے۔ قاضی عبدالودود بھی اسی سال کو زیادہ قرین قیاس سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالحق نے جو حدیں مقرر کی ہیں وہ قطعاً غلط ہیں انھیں مصحفی کے دیباچے سے جو جلوۂ خضر مصنفہ صفیر بلگرامی میں نقل بھی ہوا ہے ناواقف نہ ہونا تھا، میرا گمان ہے کہ خود مصحفی کو اپنی ولادت کا صحیح سنہ معلوم نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی متجاوز از شصت لکھتے ہیں اور کبھی قریب بہ ہشتاد۔ کل متعلقہ امور پر غور کرنے کے بعد میری رائے ہے کہ ان کی پیدائش ۶۱ھ یا

۶۲ھ میں ہی ہوئی۔ پہلا سنہ زیادہ قرین قیاس ہے۔" [۳۴]

بابائے اُردو نے مصحفی کا سالِ وفات ۱۲۴۰ھ متعین کیا۔ اس سنہ پر سب محققین کا اتفاق ہے۔ قاضی عبدالودود بھی اس سالِ وفات کو درست تسلیم کرتے ہیں لیکن بابائے اُردو نے ۱۲۴۰ھ کا تعین جن شہادتوں کی بنا پر کیا اُن کو درست تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔

"مصحفی ۱۲۴۰ھ میں فوت ہوئے تھے مگر اس سال کی تعین میں 'گلشن بیخار' مصنفہ شیفتہ سے زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ اس کا آغاز جیسا کہ خود شیفتہ کا بیان ہے ۱۲۴۸ھ میں ہوا اور ۵۰ھ سال انجام ہے (گلشن بیخار، شائع کردہ نوائے ادب) اس بنا پر کہ مصحفی کی وفات کا زمانہ دس برس قبل بتایا گیا ہے یہ کہا جائے کہ ترجمۂ مصحفی ۵۰ھ کا لکھا ہوا ہے تو اسے قبول کیا جا سکتا ہے مگر اس صورت میں اس کی بنیاد پر سال وفات کی تعین نہیں ہو سکتی۔" [۳۵]

بابائے اُردو نے مقدمے میں لکھا کہ "مصحفی ٹانڈے سے ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ لکھنؤ پہنچے یہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ سودا وہاں پہلے سے موجود تھے۔۔۔۔ ابھی سال ہی رہنے پائے تھے کہ طبیعت اُچاٹ ہوئی اور دلی کا رُخ کیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی سرپرست اور قدردان نہ ملا اور روزگار کی کوئی صورت نہ نکلی لیکن دلی میں کیا رکھا تھا۔ حالت پہلے سے بھی بدتر تھی اور تھوڑے دنوں کے بعد ہی دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔" (مقدمہ 'عقد ثریا' از مولوی عبدالحق، ص ۱۰)

قاضی عبدالودود کے نزدیک یہ 'تھوڑے دن' ۱۲ سال پر محیط ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مقدمہ نگار کا خیال ہے کہ اودھ سے دہلی گئے تو قیام زیادہ نہ رہا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی پھر لکھنؤ چلے گئے۔ ۱۲ برس کو 'تھوڑے دن' وہی کہہ سکتے ہیں۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس سے بے خبر ہیں کہ مصحفی ۹۸ھ میں لکھنؤ گئے۔" [۳۶]

'عقد ثریا' کا سنہ تصنیف مصحفی نے خود ۱۱۹۹ھ بتایا ہے۔ مولوی عبدالحق نے بھی مصحفی کی رائے سے مکمل اتفاق کیا ہے۔ جس پر قاضی عبدالودود کو شدید اختلاف ہے۔

"عقد (عقد ثریا) ۱۱۹۹ھ سے کئی سال قبل شروع ہوا تھا، یہ نہ ہوتا تو ترجمہ حاتم (ولادت ۱۱۱۱ھ) کے آغاز میں ان کی عمر ۸۳ سال نہ درج ہوتی۔

عقد نے ۱۱۹۹ھ میں کتابی شکل اختیار کر لی ہو گی لیکن بعد کو اضافے ہوتے
رہے۔ درد (متوفی ۱۱۹۹ھ) کے بارے میں مرقوم ہے کہ وفات کو چند
سال ہوئے۔ مظہر کا حال جوز میں ہے ۱۲۱۳ھ میں قلم بند ہوا
ہے۔" [۳۷]

مولوی عبدالحق نے 'عقد ثریا' کی تدوین دو قلمی نسخوں کی مدد سے کی۔ ایک نسخہ خدا بخش خاں کے کتب خانے کا تھا اور دوسرا رضا لائبریری رام پور کا۔ دونوں نسخے مولوی عبدالحق کے بقول بہت غلط اور بدخط تھے۔ تاہم مولوی عبدالحق اس بات سے مطمئن تھے کہ "مقابلے سے بعض مقامات کی کچھ نہ کچھ تصحیح ہو گئی۔" (مقدمہ 'عقد ثریا'، از مولوی عبدالحق، ص ۱۹) لیکن قاضی عبدالودود مولوی عبدالحق کے اس اقدام سے ہرگز مطمئن نہیں، لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر عبدالحق کو اعتراف ہے کہ خ و ر (خ = نسخہ خدا بخش لائبریری۔
ر = نسخہ رضا لائبریری رام پور) بہت غلط ہیں لیکن اس کے باوجود انھوں
نے عقد کے کسی اور نسخے کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس نہیں کی۔
درستی متن کی ایک دوسری صورت یہ تھی کہ فارسی گویوں کے دوسرے
تذکروں سے مدد لی جائے۔ ان میں سے بعض کے مصنفین نے عقد سے
بھی کام لیا ہے۔ انھوں نے اسے بھی غیر ضروری متصور کیا۔" [۳۸]

قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق مصحفی نے 'عقد ثریا' میں بہت سی غلط معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کی لاپرواہی کی بدولت ان کے اپنے بعض بیانات میں تناقض پیدا ہو گیا ہے لیکن مولوی عبدالحق نے عقد ثریا کے مطالب کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور مصحفی کے ہر بیان کو جوں کا توں تسلیم کر لیا ہے جب کہ مولوی صاحب کو چاہیے تھا کہ بحیثیت مرتب و مدون وہ مصحفی کے معاصر تذکرہ نگاروں کے تذکروں سے تقابل کر کے متن کے مطالب کی صحت کی جانچ کرتے لیکن انھوں نے ایسا کرنے کی زحمت نہیں اُٹھائی۔ قاضی عبدالودود کے نزدیک:

"ڈاکٹر عبدالحق نے مطالب عقد کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں کوئی
رائے ظاہر نہیں کی۔ ظاہراً انھیں اس کا احساس نہیں کہ عقد میں متعدد اغلاط
موجود ہیں۔ مصحفی کی سادہ لوحی کی وجہ سے بعض بازاری گپیں بھی اس میں
درج ہو گئی ہیں۔" [۳۹]

مولوی عبدالحق کے مرتبہ 'عقدِ ثریا' کے مطبوعہ متن میں بھی بے حد غلطیاں ہیں بلکہ مولانا امتیاز علی عرشی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "مط کی کوئی سطر غلطی سے پاک نہیں" [۴۰] یہ تو مبالغہ ہے البتہ اغلاط کی بہتات ضرور ہے۔ بہت سے الفاظ کی جگہ غلط لفظ درج ہیں۔ بہت سی عبارتیں حذف ہیں۔ اختلاف نسخ کی نشان دہی بھی سرسری اور نا قابل اطمینان ہے۔ قاضی عبدالودود نے 'عقدِ ثریا' مرتبہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا ایک غلط نامہ بھی مرتب کیا ہے جس سے بہت سی غلطیاں قلم انداز ہوئی ہیں۔ [۴۱]

بابائے اُردو کے مرتبہ و مدونہ مصحفی کے تذکرے، تذکرہ ہندی کے آخر میں درج ذیل عبارت درج ہے: "ایں تصنیف استاد زمانہ شیخ غلام ہمدانی مرحوم و مصحفی تخلص دارد کتبہ محمد علی بیگ خاک پائے (پاے) جلالی بار دوم شہر صفر ۱۲۳۸ھ تمام شد۔" ('تذکرہ ہندی'، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص۲۸۳)

اس عبارت کے بارے میں مولوی صاحب نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ یہ کس نے لکھی یا انھوں نے کہاں سے اخذ کی۔ افسر امروہوی نے مذکورہ بالا عبارت کے حوالے سے بابائے اُردو پر اعتراض کیا کہ ۱۲۴۰ھ سال وفات کیوں قرار دیا اور قاضی عبدالودود نے اعتراض کیا کہ لفظ 'مرحوم' تذکرہ ہندی کے کاتب کے قلم سے نہیں نکلا، مرتب کا اضافہ ہے۔ لیکن کتب خانہ خدا بخش میں موجود 'تذکرہ ہندی' کے قلمی نسخے سے یہ متحقق ہوا کہ یہ اضافہ بابائے اُردو کا نہیں بلکہ 'کاتب نسخہ' کا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ معلوم ہونے کے بعد قاضی عبدالودود نے نہ صرف اپنی غلطی تسلیم کی بلکہ افسر امروہوی کے اعتراضات کو بھی غلط قرار دیا جو کہ قابل تحسین فعل ہے [۴۲]۔

'نکات الشعرا' کا سنِ تصنیف میرؔ نے تذکرہ کے شروع یا آخر میں کہیں درج نہیں کیا۔ مولوی عبدالحق نے تذکرے میں مذکور آنند رام مخلص کی ذیل میں میرؔ کے اس بیان "قریب یک سال است کہ درگزشت" (مقدمہ، نکات الشعرا، ص۵) سے 'نکات الشعرا' کا سال تصنیف (۱۱۶۵ھ) متعین کیا جسے قاضی عبدالودود تسلیم نہیں کرتے۔ "ڈاکٹر عبدالحق نے اس پر غور نہیں کیا کہ ترجمۂ مخلص کے کسی خاص زمانے میں حوالۂ قلم ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساری کتاب اسی زمانے میں تحریر ہوئی تھی۔ یہ بات بھی انھیں نہ سوجھی۔ ۱۱۶۴ھ سال وفات ہے تو اس کا امکان ہے کہ مخلص محرم یا صفر میں فوت ہوا ہے۔ اس صورت میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ترجمہ مخلص ۱۱۶۴ھ میں مرقوم ہی تھا تو کوئی مانع نہیں۔ نکات میں قریب یک سال ہے۔" (مولوی عبدالحق

بحیثیت محقق، ص ۱۱۷)

گارساں دتاسی، اشپرنگر اور امتیاز علی عرشی کے حوالے سے طویل بحث کے بعد قاضی عبدالودود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ 'نکات الشعرا' کا سال آغاز ۱۱۶۴ھ ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر سمجھا جائے کہ اس کی ابتدا ۱۱۶۱ھ اس سے بھی کچھ قبل ہوئی تھی (مولوی عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۲۲) لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی (ادبی تحقیق، ص ۳۰۳) اور مولانا امتیاز علی عرشی (مقدمہ دستور الفصاحت، ص ۸۵) نے تحقیق کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا کہ 'نکات الشعرا' اپنی موجودہ صورت میں ۱۱۶۵ھ تک لکھا جاتا رہا تھا اور غالباً اسی سال ختم ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'نکات الشعرا' کے سال تصنیف کے حوالے سے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ

> ''میر کے 'نکات الشعرا' کا ایک نقش اول بھی تھا جس میں ایسے شاعروں کا ذکر تھا جو متداول 'نکات الشعرا' میں نہیں ہے اور جس میں انھوں نے اپنے معاصرین اور دوسرے شعرا کے بارے میں ایسی باتیں لکھی تھیں جنہیں پڑھ کر وہ چراغ پا ہو گئے تھے۔'' [۴۳]

اسی لیے میر نے اس پر نظر ثانی کی اور ترمیم و اضافوں کے بعد اسے موجودہ شکل دی۔

> ''نکات الشعرا کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس کا نقش اول ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے تقریباً ۱۱۶۰ھ میں لکھا جا چکا تھا اور بعد میں میر نے قطع و برید اور حک و اضافہ کے بعد اسے موجودہ شکل میں ۱۱۶۵ھ میں یا اس کے کچھ بعد مکمل کیا۔'' [۴۴]

بہر حال 'نکات الشعرا' کے سال تکمیل کے حوالے سے محققین ۱۱۶۵ھ پر متفق ہیں۔ سال تکمیل کے حوالے سے ہی 'نکات الشعرا' کو 'شمالی ہند' کے تذکروں میں اولیت کا درجہ دیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق کے مرتبہ 'نکات الشعرا' کا جائزہ لیتے ہوئے قاضی عبدالودود نے مولوی عبدالحق کی اس رائے سے بھی اختلاف کیا جو انھوں نے میر کے تنقیدی شعور کے حوالے سے دی کہ ''اس میں عموماً اور اکثر شعراء کے کلام پر منصفانہ اور بے باکانہ تنقید پائی جاتی ہے۔ یہ بات دوسرے تذکروں میں نظر نہیں آئے گی۔'' (مقدمہ 'نکات الشعرا'، ص ۶) قاضی عبدالودود کے نزدیک:

"نکات کے ۱۰۳ شعرا میں سے صرف تیرہ ایسے ہیں جن کے کلام کی نسبت میر کی رائے بے باکانہ کہی جا سکتی ہے۔۔۔۔ بیشتر کلام کے بارے میں کوئی رائے ہی ظاہر نہیں کی، بعضوں کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے مطلقاً بے باکی کی ضرورت نہ تھی۔۔۔۔ بعض اوقات تو صریحاً ذاتی عداوت جھلکتی ہے میرا یہ بھی خیال ہے کہ نکات سی کتاب کسی شخصیت کی اس نوع کی تنقید کے لیے جو اس میں موجود نہیں یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ کلام پر بے باکانہ تنقید جیسی نکات میں ہے کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ملتی۔
تذکرہ شیفتہ کا مطالعہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کافی ہوگا۔" [۳۵]

مولوی عبدالحق نے "نکات الشعرا" کے مقدمے میں لکھا کہ نکات الشعرا شروع سے آخر تک دلی میں لکھا گیا اور سوائے دکن کے چند شعرا اور بعض قدیم ریختہ گو شعرا کے باقی سب کے سب دلی کے شاعر ہیں اور ان میں بھی اکثر ایسے جن سے میر بذات خود واقف تھے (مقدمہ نکات الشعرا، ص ۸) جب کہ قاضی عبدالودود کی تحقیق کے مطابق "نکات کے ۱۰۳ شاعروں میں سے ۳۳ دکنی ہیں (دکنی میں میں نے گجراتی کو بھی ملا لیا ہے) اور بظاہر ان میں سے بہت کم دہلی آئے ہیں۔ ایسے شعرا جنھیں میر نے صراحتاً دہلوی لکھا ہے یا جن کا دہلوی ہونا کسی دوسرے ذریعے سے ثابت ہے چالیس سے کچھ ہی زیادہ ہوں گے باقی شعرا کا وطن یا تو معلوم نہیں یا دلی سے باہر ہے۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۲۷)

قاضی صاحب نے مولوی صاحب کے اس جملے "ایجاز کے ساتھ اس (نکات الشعرا) کی عبارت میں شگفتگی اور پختگی بھی ہے۔" (مقدمہ نکات الشعرا، ص د) کا بھی سختی سے مواخذہ کیا ہے۔ "کچھ جگہ نہ ہو تو اختصار خود بخود آ جائے گا اختصار کی حد یہ ہے کہ متعدد شعرا کا صرف تخلص لکھا ہے اور متعدد شعرا کے تخلص کے بعد [illegible] کے بعد کچھ اور نہیں ملتا۔ ایجاز کی مثالیں کم ہیں بعض مقامات پر تنافی سے کام لیا ہے (ملاحظہ ہو تراجم [illegible])۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۲۷) اس کے ساتھ ساتھ قاضی عبدالودود نے "نکات الشعرا" میں موجود ناپختہ عبارات کی بھی ایک طویل فہرست اپنے مقالے کے ساتھ منسلک کی ہے۔ انھوں نے مولوی عبدالحق کے مرتبہ "نکات الشعرا" اور اس کے مقدمے پر اس حوالے سے بھی سخت تنقید کی ہے کہ میر کی شخصیت اور شاعری کی اردو شعر و ادب میں خاص اہمیت کے پیش نظر مولوی عبدالحق کو اپنے مقدمے میں میر کے نثری اوصاف

اور بالخصوص 'نکات الشعرا' کی نثر اور نظم کے مفردات اور مرکبات کو زیر بحث لانا چاہیے تھا لیکن افسوس انھوں نے اس طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ لہٰذا یہ کام بھی قاضی صاحب کو کرنا پڑا انہوں نے 'عبدالحق بحیثیت محقق' ص ۱۲۸ تا ۱۴۵، 'نکات الشعرا' کی نثر اور نظم میں درج مفردات اور مرکبات کی طویل فہرستیں الگ الگ مرتب کی ہیں۔

'سب رس' کے مقدمے میں مولوی عبدالحق نے وجہی کی دو کتابوں کا ذکر کیا۔ ایک مثنوی قطب مشتری اور دوسری نثر کی کتاب 'تاج الحقائق'۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے 'تاج الحقائق' سے متعلق بابائے اُردو کی تحقیق کو رَد کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ملا وجہی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کا مصنف دسویں صدی ہجری کے میاں جی شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں [۴۶]۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک 'تاج الحقائق' کو ملا وجہی سے منسوب کرنا تحقیقی اندھیر ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''تاج الحقائق بھی وجہی سے منسوب کی جاتی ہے جو یقیناً وجہی کی تصنیف نہیں ہے۔ کہیں کہیں سب رس اور تاج الحقائق کے موضوعات ایک دوسرے سے ضرور ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو اس زمانے میں عام تھے اور ان کی تاویل ہر شخص اپنے اپنے انداز میں کرتا تھا۔ 'تاج الحقائق' کے مصنف 'وجیہ الدین محمد' ہیں۔'' [۴۷]

'تاج الحقائق' کا جو قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی میں موجود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی عبارت بھی نقل کی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاج الحقائق ملا وجہی کی تصنیف نہیں ہے۔ ''کلام مولانا وجیہ الدین محمد۔۔۔ جنو کی بات خدا کی بات میں سند۔ کتاب تاج الحقائق، رواح الحقائق، سراج الحقائق، معراج الحقائق جس کتاب کوں مطالعے کر۔۔۔تے خدا بیگ پایا جائے۔'' تاج الحقائق کو ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں سید ابصار علی شاہ ابن سید اکبر علی شاہ قادری نے عام فہم زبان ہندی میں لکھا۔ اس کے مطالعے سے بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ 'تاج الحقائق' کے مصنف مولانا وجیہ الدین ہیں۔ [۴۸]

'سب رس' کے ماخذ کا کھوج لگانا مولوی عبدالحق کا اہم ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ اپریل ۱۹۶۹ء میں دیوی سنگھ چوہان نے مراٹھی ساہتیہ پتر کا میں انکشاف کیا سب رس کرشن مشر کے سنسکرت ناٹک پربودھ چندرودے سے ماخوذ ہے لیکن ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے اپنے تحقیقی مقالے

'سب رس کی تنقیدی تدوین' میں اس بات کو رد کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک 'حسن و دل' سنسکرت ڈرامے سے کافی مختلف ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے اپنی کتاب 'اُردو میں تمثیل نگاری' (۱۹۷۷ء) اور ڈاکٹر پرکاش مونس نے اپنی کتاب 'اُردو ادب پر ہندی ادب کا اثر' (۱۹۷۸ء) میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قصہ' حسن و دل' کا بنیادی خیال ضرور 'پر بودھ چندرودے' سے لیا گیا ہے لیکن یہ اس کا ترجمہ نہیں۔ [۴۹]

مولوی عبدالحق نے ثابت کیا ہے کہ 'سب رس' کا قصہ وجہی کا طبع زاد قصہ نہیں بلکہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی پانچ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی 'دستور عشاق' کے نثری خلاصے 'حسن و دل' سے ماخوذ ہے جب کہ ممتاز احمد مولوی صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے سب رس کو ترجمہ یا تالیف کی بجائے وجہی کی طبع زاد داستان قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک سب رس کی کہانی دراصل وجہی کی آپ بیتی ہے۔ سب رس میں وجہی نے تمثیلی انداز میں اپنی ناکام محبت کا نقشہ، بادشاہ کے تیور اور زمانے کی رو کو ایک طویل داستان میں ڈھال دیا ہے [۵۰]۔

مولوی عبدالحق کا اصرار ہے کہ وجہی نے صرف فتاحی کے نثری خلاصے 'حسن و دل' سے استفادہ کیا ہے۔ فتاحی کی پانچ ہزار اشعار کی مثنوی 'دستور عشاق' اس کی نظر سے نہیں گزری۔ انھوں نے مقدمے میں وجہی کی سب رس اور فتاحی کی دستور عشاق کا تقابلی مطالعہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وجہی کی 'سب رس' دستور عشاق سے کن کن مقامات پر مختلف ہے لیکن عزیز احمد بابائے اُردو کی اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک وجہی نے حسن و دل کے ساتھ ساتھ دستور عشاق سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے [۵۱]۔

ملا وجہی 'سب رس' کی زبان کو ہندی یا زبان ہندوستان کہتا ہے جب کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'سب رس' کی زبان دکنی بھی کہا اور قدیم اُردو بھی۔ ان کے نزدیک ''سب رس اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے جو ادبی اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔'' (مقدمہ 'سب رس' از مولوی عبدالحق، ص ۳۷) حافظ محمود شیرانی نے بھی سب رس کی زبان کو 'اُردو' قرار دیا ہے [۵۲]۔ جب کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کے نزدیک یہ دعویٰ بے دلیل ہے کہ سب رس کی زبان 'اُردو' ہے۔

''ملا وجہی نے کہیں بھی نہیں کہا ہے کہ میں اُردو زبان میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ اگر وجہی ہماری زبان سے واقف تھا تو اس کے ناموں میں سے

اُردو، زبان اُردو، زبان اُردوئے معلی، ریختہ، کھڑی بولی کوئی نام تو لیتا
کیوں کہ یہی چند نام ہیں جن سے ہماری زبان وقتاً فوقتاً موسوم ہوتی رہی
ہے لیکن وجہی نے ان ناموں میں سے کوئی ایک نام بھی نہیں لیا اور لیا تو
صرف زبان ہندوستان کا نام۔'' [۵۳]

ڈاکٹر سہیل بخاری کے نزدیک دکنی اور اُردو ایک نہیں بلکہ دو الگ الگ زبانیں ہیں اور 'سب رس' کی زبان نہ تو دکنی ہے اور نہ قدیم اُردو بلکہ 'ہندوستانی' ہے جیسا کہ وجہی نے خود کہا۔ وجہی شمالی ہند اور دکن کی زبان میں فرق کرتا ہے اسی بات پر مولوی عبدالحق نے بھی خوشی کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''یہ پہلا شخص ہے جو اس زبان کو زبان ہندوستان کہتا ہے اور یہ اشارہ کافی ہے اس امر کے لیے کہ یہ زبان کہاں سے آئی۔ یہی کتابیں ہیں جو زبان کے محقق اور مورخ کے لیے دلیل راہ کا کام دیتی ہیں۔'' (مقدمہ 'سب رس'، ص ۳۸)

مولوی صاحب کے خیال میں 'زبان ہندوستان' سے وجہی کی مراد 'اُردو زبان' ہے اور اہلِ ہند سے مراد شمالی ہند والے ہیں جس سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق وجہی کے ہندوستان کو شمالی ہند کہتے ہیں اور یہ بات
نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وجہی صرف ایک زبان کی بات کر رہا ہے اور
زبان ہندوستان سے صرف ایک زبان مراد لے رہا ہے اور جس علاقے کو
مولوی صاحب شمالی ہند کہہ رہے ہیں اس میں اُردو کے علاوہ اور بھی بہت
سی زبانیں رائج ہیں۔ دراصل یہ بحث ہند اور ہندوستان کے لفظوں کی
ہے جنھوں نے یہ سب غلط فہمی پھیلائی ہے۔ مولوی صاحب کا خیال ہے
کہ وجہی نے لفظ ہندوستان شمالی ہند کے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ خیال
درست نہیں کیوں کہ ہند اور ہندوستان کے الفاظ اُردوئے معلی اور شہر دہلی
کے لیے بولے جاتے تھے۔'' [۵۴]

طویل بحث کے بعد ڈاکٹر سہیل بخاری نے یہ ثابت کیا ہے کہ

''زبان ہندوستان سے وجہی دہلی کی زبان مراد لیتا ہے نہ کہ شمالی ہند کی
زبان اور دہلی میں اس وقت صرف ایک ہی زبان رائج تھی جو ہریانی تھی
کیوں کہ دہلی کا شہر ہریانے کے علاقے میں واقع ہے۔ ۱۶۳۵ء تک جب

کہ وجہی نے 'سب رس' لکھی ہے شہر دہلی میں اُردو کا رواج ہی نہیں تھا۔
دہلی میں اُردو کا داخلہ پہلی بار ۱۶۴۷ء میں اُردوئے معلیٰ کا علاقہ بسنے کے
بعد ہوتا ہے۔'' [۵۵]

'سب رس' کی تدوین کے وقت مولوی عبدالحق کے پیش نظر چار مخطوطے تھے۔ دو مکمل اور دو ناقص۔ انھوں نے مکمل مخطوطوں میں سے مخطوطہ مکتوبہ ۱۱۷۷ھ کو بنیاد بنایا اور دوسرے مکمل مخطوطے سے بھی جو ۱۱۷۰ھ کا لکھا ہوا ہے تصحیح وترتیب میں مدد لی۔ سید قدرت نقوی کے خیال میں ۱۱۷۰ھ کے نسخے کو بنیاد بنانا چاہیے تھا۔ ایسا نہ کر کے مولوی صاحب نے اصولی طور پر غلطی کی ہے۔

''(بابائے اُردو مولوی عبدالحق) نے مخطوطہ مکتوبہ ۱۱۷۷ھ کو بنیاد بنایا۔ یہ بات مرتب فہرست 'مخطوطات انجمن ترقی اُردو' نے فہرست میں بھی ظاہر کی ہے نیز مخطوطہ کے مطالعہ سے بھی یہی ظاہر ہے جس پر مولوی صاحب کے قلم سے تصحیح وغیرہ لکھی پائی جاتی ہے اور کاتب نے بھی حسب رواج کتابت کے صفحات کا نمبر شمار بھی لکھا ہے۔ دوسرا مخطوطہ ۱۱۷۰ھ کا ہے۔
اصولاً اس مقدم نسخے کو بنیاد بنایا جانا چاہیے تھا خدا معلوم مولوی عبدالحق نے اس اصول تدوین کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ اگر چہ اس نسخے سے مدد ضرور لی ہے مگر اس نسخے کو انھوں نے ذیلی نسخہ قرار دے کر ایک اصولی غلطی کی ہے۔'' [۵۶]

'کہانی رانی کیتکی' انشاء کی جدت طبع کا انوکھا کارنامہ ہے۔ مقدمے میں مولوی صاحب نے لکھا کہ ''انشاء نے جو دعویٰ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ اس میں عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا۔'' (مقدمہ 'کہانی رانی کیتکی'، ص ۴۰) لیکن مولوی صاحب کا یہ دعویٰ صحت سے خالی ہے کیوں کہ 'کہانی رانی کیتکی' میں محققین نے متعدد ایسے عربی اور فارسی الفاظ کی نشان دہی کی ہے جو انشاء نے شعوری یا غیر شعوری طور پر استعمال کیے ہیں۔ مثلاً لتہ، سر، بیچارہ، نہ، وائے، مول، قبلہ، چپہ چپہ وغیرہ [۵۷]۔ مولوی عبدالحق نے 'کہانی رانی کیتکی' کی زبان کو 'ہندوستانی' قرار دیا ہے۔ ''آج کل سی ہندی بھی نہیں، نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا، اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں۔ اسی کا نام ہندوستانی ہے۔'' (مقدمہ 'کہانی رانی کیتکی'، ص ۴۰)

لیکن ڈاکٹر گیان چند جین، سید قدرت نقوی اور ڈاکٹر عابد پشاوری نے 'کہانی رانی کیتکی' کی زبان کو خالصتاً اُردو زبان قرار دیا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''رانی کیتکی کی کہانی کو اُردو والے بھی اپناتے ہیں اور ہندی والے بھی ذیل کے دلائل کی بنا پر اسے اُردو کی تصنیف قرار دینا زیادہ صحیح ہے۔

۱۔اُردو میں ایسی نثر لکھنا جس میں عربی و فارسی کا کوئی لفظ نہ آئے ایک اجتہاد تھا ہندی میں ایسی عبارت لکھنا کسی طرح کمال کی دلیل نہیں۔

۲۔قصے کی ابتدا میں اُردو کے ڈھنگ پر حمد و نعت ہے۔

۳۔قصے میں جتنے اشعار ہیں ایک مقام کے علاوہ اُردو اوزان میں ہیں۔

۴۔انشا اُردو کے ادیب تھے۔ ہندی میں انھوں نے کوئی دوسری تصنیف نہیں کی۔

انشاء نے قصے کی زبان کے سلسلے میں جو التزامات کیے ان کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے:

۱۔اس میں باہر کی بولی یعنی عربی فارسی یا ترکی کے الفاظ نہ ہوں۔

۲۔گنواری یعنی برج اور اودھی وغیرہ سے احتراز کیا جائے۔

۳۔بھاکھا پن نہ ٹھوس جائے یعنی سنسکرت آمیز ہندی نہ ہو۔'' [۵۸]

سید قدرت نقوی کے نزدیک: ''اسلوب سرتاسر اُردو سے متعلق نظر آتا ہے جس میں مقفیٰ اور مسجع عبارت کو اولین درجہ حاصل ہے۔'' [۵۹]

ڈاکٹر عابد پیشاوری کے بقول:

''اصلاً یہ کہانی اُردو میں لکھی گئی ہے اگرچہ یہ اپنی زبان کے اعتبار سے ہندی بلکہ ہندوستانی سے زیادہ قریب ہے اور اسی سبب ہندی والوں نے اسے اپنایا بھی ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے یہ خالص اُردو ہے۔ انشاء نے ہندی لکھنے کا دعویٰ بھی نہیں کیا 'ہندوی' کو ہندی بنا دینا بعد کی تحریف ہے۔'' [۶۰]

بابائے اُردو پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو ہمیشہ اولیت دیتے تھے۔ دوسروں کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کرتے تھے اور اکثر دوسروں کا کام اپنے نام سے شائع کردیتے تھے۔اس حوالے سے قائم کے تذکرے 'مخزن نکات' کی روایت کا ہم نے مذکورہ

بالاسطور میں ذکر کیا۔ 'کہانی رانی کیتکی' طبع دوم کے سلسلے میں بھی بابائے اُردو پر یہی الزام عائد کیا جاتا ہے جس کے لیے بعد میں مولوی صاحب کو معذرت بھی کرنی پڑی۔ 'کہانی رانی کیتکی' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں انجمن ترقی اُردو پاکستان سے شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے لیے تمام کام مولانا امتیاز علی عرشی نے کیا تھا۔ اکبر علی خان نے مولانا عرشی کی مرتبہ کتب میں 'کہانی رانی کیتکی' اور 'کنور اودے بھان کی' کو بھی شامل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ انشاء کی مشہور کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے مولانا عرشی نے کتاب خانہ رضائیہ رام پور کے دو خطی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو (پاکستان) سے شائع ہوئی ہے اور اس پر غلطی سے مرتب کی جگہ مولانا عبدالحق کا نام چھپ گیا ہے۔'' [۶۱]

ڈاکٹر گیان چند جین نے 'کہانی رانی کیتکی' اور 'کنور اودے بھان کی' کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۵ء کو ایک 'منصوبہ بند فروگذاشت' قرار دیا ہے۔

''کتاب کے شروع میں سب سے پہلے مختصر سا دیباچہ طبع ثانی ہے لیکن دیباچہ نگار کا نام نہیں دیا۔ یقینی ہے کہ یہ عرشی صاحب کا لکھا ہوا ہے کیوں کہ اس میں جو تشریح اختصارات دی ہے اس میں دو عدد نسخہ قلمی کتاب خانہ کا تعارف ہے۔ واضح نہیں کیا گیا کہ کون سا کتاب خانہ مراد ہے۔ شاید یہ بھرم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ نسخے انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانے میں ہیں لیکن ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ نسخے اسٹیٹ لائبریری رام پور میں ہیں۔ بے نام دیباچۂ طبع ثانی کے بعد دیباچہ اول ہے جس کے آخر میں مولوی عبدالحق کا نام ہے اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ دیباچہ طبع ثانی بھی اُنہی کا ہوگا اور قلمی و مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ کر کے ترتیب متن کا کام بھی انہی نے کیا ہوگا۔ چوں کہ یہ عرشی صاحب کا کام تھا اس لیے یہ دیانت برتی گئی کہ طبع ثانی میں سرورق پر مرتب کی حیثیت سے کوئی نام ہی نہیں دیا۔ پہلے ایڈیشن کو یاد کر کے قاری اسے بھی مولوی صاحب سے منسوب کرے گا یہ ایک منصوبہ بند فروگذاشت معلوم ہوتی ہے۔'' [۶۲]

'باغ و بہار' کی تدوین کرتے ہوئے بابائے اُردو کے پیش نظر کون کون سے قلمی اور مطبوعہ نسخے تھے اور کس نسخے کو انھوں نے بنیادی نسخہ بنایا اور یہ نسخے انھیں کہاں سے دستیاب ہوئے تھے۔ بابائے اُردو نے اس کی وضاحت مقدمے میں نہیں کی۔ 'باغ و بہار' کا مستند متن تیار کرتے ہوئے انھوں نے حواشی اور اختلافات نسخ کا التزام بھی نہیں کیا لیکن 'باغ و بہار' کے لیے ۲۶ صفحات پر مشتمل جو مقدمہ انھوں نے لکھا تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کا حامل ہے جس کے منظر عام پر آنے کے بعد 'باغ و بہار' اور اس کے مصنف کے حوالے سے مختلف تحقیقی مباحث کا آغاز ہوا۔

میر امن نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں باغ و بہار کے قصے کو امیر خسرو سے منسوب کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھا کہ یہ فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ بابائے اُردو نے پہلی بار تحقیقی نقطۂ نظر سے یہ ثابت کیا کہ 'باغ و بہار' امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے اور نہ ہی فارسی قصے چہاردرویش کا ترجمہ ہے بلکہ اس کا اصل ماخذ عطا حسین خاں تحسین کی 'نوطرز مرصع' ہے (مقدمہ 'باغ و بہار'، ص)۔ مولوی عبدالحق نے مقدمے میں باغ و بہار، نوطرز مرصع اور فارسی قصے کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔ ۱۹۳۳ء میں حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون 'چار درویش' (مطبوعہ کارواں، لاہور) میں باغ و بہار کی اشاعتِ اول کے سرورق کی عبارت نقل کر کے مولوی عبدالحق کی اس تحقیق کو غلط ثابت کر دیا جس میں واضح طور پر یہ صراحت موجود ہے کہ ''باغ و بہار تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا ماخذ اس کا نوطرز مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا ہے فارسی قصہ چہاردرویش سے۔'' [۶۳]

ابتدائی چند اشاعتوں کے بعد بازاری ناشروں نے اس عبارت کو حذف کر دیا۔ مولوی عبدالحق کے پاس باغ و بہار کا جو نسخہ تھا اس کے سرورق پر بھی یہ عبارت درج نہیں تھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''۱۹۳۱ء میں مولوی عبدالحق نے جب باغ و بہار کو مرتب کر کے شائع کیا تو انھوں نے فارسی نسخے، نوطرز مرصع اور باغ و بہار کے متعدد اقتباسات درج کر کے یہ ثابت کیا کہ امن کا ماخذ نوطرز مرصع ہے نہ کہ فارسی نسخہ۔ مولوی صاحب کی تحقیق کا تمام تر زور اسی انکشاف کے ثابت کرنے میں صرف ہو گیا۔۔۔۔ 'تحصیل حاصل' کا اطلاق جس صحت کے ساتھ مولوی عبدالحق

کی مذکورہ بالا بحث پر ہوتا ہے شاید اور کسی انکشاف یا اجتہاد پر نہ
ہو۔" [۶۴]

ڈاکٹر گیان چند جین نے بابائے اُردو کی اس تحقیق سے بھی اختلاف کیا ہے کہ میر امن کا ماخذ صرف نوطرز مرصع ہے۔ ان کے نزدیک: "نوطرز مرصع میر امن کا واحد ماخذ نہیں۔ انھوں نے کسی فارسی نسخے سے بھی یقیناً استفادہ کیا ہے کیوں کہ بعض مقامات پر وہ نوطرز مرصع سے کافی ہٹ جاتے ہیں۔" [۶۵]

میر کے تذکرے 'نکات الشعراء' کے علاوہ بابائے اُردو نے میر کے کلام کا انتخاب اور میر کی خودنوشت سوانح 'ذکر میر' کو بھی مرتب کیا جن پر قاضی عبدالودود نے بے شمار اعتراضات اُٹھائے۔ انتخاب کلامِ میر پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ مقدمے میں مولوی صاحب نے یہ صراحت نہیں کی کہ اشعار کا انتخاب انھوں نے کلیاتِ میر کے کس نسخے سے کیا۔ غزلوں کے انتخاب میں کوئی ترتیب نہیں رکھی گئی۔ غزلوں سے جو قطعات لیے گئے ان کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ کسی مسلسل غزل کے آخر سے یا کسی بھی مقام سے اپنی مرضی سے اشعار حذف کر دیئے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی وضاحت بھی نہیں کی۔ متن میں بکثرت اغلاط ہیں جن کی وجہ سے متعدد اشعار موزوں نہیں رہے۔

قاضی عبدالودود نے متن کی اغلاط کے ساتھ انتخاب کلامِ میر کے لیے لکھے گئے مولوی صاحب کے مقدمے کی ہر سطر پر گرفت کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مولوی صاحب کو اوزان و بحور سے کوئی خاص مناسبت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 'انتخابِ کلامِ میر' کے متعدد اشعار بے وزن ہیں اور 'ذکر میر' کو ماخذ بنا کر مولوی صاحب نے میر کے جو سوانحی حالات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی عبارات کی تفہیم میں ان سے ہر قدم پر غلطیاں ہوئی ہیں۔ 'انتخاب کلامِ میر' پر قاضی عبدالودود کا تبصرہ پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی ضبط کر لینا چاہیے تھا۔ اکثر مقامات پر ان کے لہجے میں چڑچڑا پن در آیا ہے۔ راقمہ نے باب سوم میں انتخاب کلام میر کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے بھی اس بات کی نشان دہی کی کہ میر تقی میر کی شخصیت اور شاعری پر رائے دیتے ہوئے اکثر مقامات پر مولوی صاحب کے لہجے پر جذباتی عقیدت مندی کا غلبہ ہے لیکن اس کا مواخذہ قاضی صاحب نے جس سخت لہجے میں کیا اس میں طنز اور تمسخر کا غلبہ ہے۔ مثال کے طور پر قاضی صاحب کا انداز ملاحظہ ہو۔ مولوی عبدالحق نے

مقدمہ انتخابِ کلام میر، ص ۱۳ پر میر کی لکھنؤ آمد کا بیان پانچ سطروں میں لکھا جس کی ہر سطر کو ''واوین'' میں دے کر قاضی صاحب نے تبصرہ کیا۔ مولوی صاحب نے لکھا کہ ''لکھنؤ آنے سے پہلے میر صاحب کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی چناں چہ جب آپ یہاں پہنچے ۔۔۔۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک نے اعزاز وقدر دانی میں سبقت کی۔'' (ص ۱۳)۔ قاضی عبدالودود نے 'مولوی عبدالحق بحیثیت محقق' میں لکھتے ہیں: ''(الف) 'بادشاہ سے لے کر فقیر تک' اودھ میں بادشاہ کہاں تھا جو میر کی قدر دانی کرتا۔'' (ص ۹۷)۔ مولوی صاحب نے اگلی سطر میں لکھا: ''دُور دُور سے لوگ اس شوق میں آتے تھے کہ میر صاحب کی زبان مبارک سے ان کا کلام سنیں اور اپنے اپنے شہروں کو ان کے اشعار بطور سوغات لے جائیں۔'' قاضی صاحب کا انداز: ''(ب) 'دُور ۔۔۔ لے جائیں' ڈاکٹر عبدالحق کو کہاں سے معلوم ہوئی؟'' مولوی صاحب کی آخری سطر یوں تھی: ''یہ مقبولیت اُردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔'' قاضی صاحب لکھتے ہیں: ''(ج) 'یہ مقبولیت ۔۔۔ تھی' سودا اپنے زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک میر سے بہت زیادہ مقبول تھا۔'' (ص ۹۷)

میر کی سیرت اور شخصی اوصاف کے حوالے سے مولوی صاحب نے جو کچھ لکھا قاضی صاحب نے اس پر بھی سختی سے تنقید کی ہے۔ بابائے اُردو نے لکھا کہ ''میر کی سیرت ان کے کلام سے کچھ کم قابل قدر نہیں بلکہ میری رائے میں زیادہ قابل وقعت ہے۔'' (مقدمہ، انتخاب کلامِ میر، ص ۳۳) جس کو رَد کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: ''نہ یہ صحیح ہے کہ میر کی سیرت ان کے کلام سے زیادہ قابل وقعت ہے اور نہ اس کا ثبوت موجود ہے کہ ان کی قدر زیادہ تر ان کی سیرت کی وجہ سے ہوئی ۔۔۔ ڈاکٹر عبدالحق کے قلم سے اس سلسلے میں جو نکلا ہے وہ حد درجہ غیر ذمہ دارانہ ہے۔ ذکرِ میر نہ بھی ہوتی تو کلیاتِ میر اور تذکرہ نگاروں کے اقوال اس کی تردید کے لیے کافی تھے۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۰۱-۱۰۲) بابائے اُردو کے نزدیک: ''میر نے شاعری کو ذریعہ عزت یا وسیلہ معاش نہیں بنایا۔'' (مقدمہ، انتخاب کلام میر، ص ۳۳) قاضی عبدالودود کو مولوی صاحب کی اس رائے سے بھی اختلاف ہے: ''یہ بالکل صحیح نہیں کہ میر نے شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ امراء تک ان کی رسائی اس کی بدولت ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض سرکاروں میں تنخواہ سپاہی کی حیثیت سے پاتے ہوں۔ ذکرِ میر میں لڑائیوں کا بیان ہے لیکن کہیں یہ نہیں کہ خود بھی لڑتے تھے۔ میر 'ذکرِ میر' ص ۱۲۲ میں لکھتے ہیں: ''چوں سبب شعر شہرت من بسیار بود، مردماں رعایت گونہ بحال من مبذول داشتند۔'' مولوی صاحب کا یہ لکھنا کہ 'محتاج رہے، مگر ممکن نہ تھا کہ

کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں ان کے مذہب میں یہ کفر تھا۔" (مقدمہ، 'انتخاب کلامِ میر'، ص۳۴) قاضی صاحب کے نزدیک: "۔۔۔ بے اصل بات ہے وہ خود دست سوال دراز نہیں کرتے تھے اور کسی دوسرے کی مجال نہ تھی کہ ان کی مدد کا خیال بھی دل میں لاسکے، تو پھر زندہ کس طرح رہتے تھے؟ باپ نے تو ۳۰۰ کتابوں کے علاوہ کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا۔" (ذکر میر، ص۵۹) "ڈاکٹر عبدالحق جو چاہیں کہیں، خود میر کو اقرار ہے۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص۱۰۲)

میر کا اقرار (نثری اور شعری) بھی انھوں نے ثبوت کے طور پر اپنے مقالے میں پیش کیا اور لطف کی بات یہ کہ میر کے اشعار انھوں نے 'انتخابِ کلامِ میر' مرتبہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق سے نقل کیے ہیں:

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا ضعف قویٰ سے دست بہ دیوار واں گیا
محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچار واں گیا

پرداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
فتنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے

(ص۱۰۲-۱۰۳)

مولوی عبدالحق نے میر کی وضع داری، قناعت و بے نیازی اور صبر و استقلال کی بے حد تعریف کی۔ ان کے نزدیک یہی وہ خوبیاں ہیں جو انسانیت کو کمال انسانیت پر پہنچاتی اور فرشتوں سے بڑھا دیتی ہیں اور یہ تمام خوبیاں میر کی ذات میں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں۔ "کسی کے سامنے سر جھکانا یا کسی سے اظہار مدعا کرنا ان کے یہاں سب سے بڑی معصیت تھی۔۔۔۔۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی مدح میں قصیدہ لکھیں بالکل عبث ہے۔ ان کی غیرت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کسی نااہل کی بھٹئی کریں۔" (مقدمہ، انتخابِ کلامِ میر، ص۳۳-۳۴) مولوی عبدالحق کے اس بیان پر قاضی عبدالودود نے پُرزور احتجاج کیا لکھتے ہیں: "یہ صورت تھی تو قصیدے کہاں سے آگئے۔ میر کے قصائد کامیاب ہوں یا ناکامیاب۔ انھوں نے بھٹئی میں کمی نہیں کی۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص۱۰۳) انھوں نے نواب آصف الدولہ کی شان میں میر کے قصیدہ کے چند اشعار بھی اپنے بات کے ثبوت میں نقل کیے ہیں:

تیرے محرر دفتر کا ہے سدا محتاج — جہاں میں شہرہ عطار جو ہے فلک کا دبیر
شریک مشورہ کارخانہ عالم — کیا ہے تجھ کو قضا و قدر ہیں تیرے مشیر
کروں میں عرض سو کیا لفت گنج خسرو کو — کہ تیرے بخش دیئے کے نہیں ہیں عشر عشیر

(مولوی عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۰۳)

غرض مقدمہ انتخاب کلام میرؔ میں مذکور مولوی عبدالحق کے قلم سے نکلے ہر حرف پر قاضی عبدالودود نے حرف گیری کی ہے حالاں کہ اسی مقدمہ کو رشید حسن خان نے میرؔ شناسی کی روایت کا نقش اول قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مرحوم کے مرتب کیے ہوئے 'انتخاب میرؔ' کے مقدمے میں میر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کو اس طرح پیش کیا کہ اس کی طرف نئے انداز سے ذہن متوجہ ہوئے۔ یہ کہنا کسی لحاظ سے بے جا نہ ہوگا کہ جس چیز کو میرؔ شناسی کی روایت کہا جاتا ہے اس روایت کا نقش اسی مقدمے سے بنا تھا۔'' [۲۶]

مولوی عبدالحق کی مرتبہ 'ذکر میرؔ' پر قاضی عبدالودود نے ترانوے (۹۳) صفحات پر مشتمل تبصرہ علاحدہ علاحدہ عنوانات کے تحت کیا۔ اپریل ۱۹۲۶ء کے رسالہ 'اُردو' میں بابائے اُردو نے 'ذکر میرؔ' پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا۔ قاضی عبدالودود نے اپنے تبصرے کا آغاز اسی مقالے کے جائزے سے کیا۔ اس کے بعد 'ذکر میر' کے لیے لکھا ہوا بابائے اُردو کا 'مقدمہ' اور بابائے اُردو مرتبہ 'ذکر میر' کے متن کا تفصیلی تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے: ''میر کی شخصیت کے متعلق مرتب کی رائے کا قبول کرنا ممکن نہیں اور یہی حال ذکر (ذکر میر) کا ہے۔'' (ص ۵۰) اور ذکر میرؔ، قاضی عبدالودود کے نزدیک: ''خاص مقاصد کے تحت قلم بند ہوئی ہے آپ بیتی کی حیثیت سے یہ قطعاً نامناسب ہے اور بدترین آپ بیتیوں میں سے ہے جو میری نظر سے گزری ہیں۔'' (ص ۵۰) قاضی عبدالودود کے نزدیک: ''میرؔ ایسے شخص نہیں کہ جس کے بارے میں وہ جو کچھ کہہ دیں بے چوں چرا تسلیم کرلیا جائے۔ ذکر میر ایسی آپ بیتی نہیں جس میں لکھنے والا جو کچھ اس پر گزری ہے، بے کم وکاست بیان کردیتا ہے۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۵۰)

'ذکر میرؔ' میر تقی میرؔ نے چند خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی تھی جن میں اپنے خاندان کی شرافت ونجابت کا مبالغہ آمیز ذکر، خود کو درویشی کے منصب پر فائز بتانا، خاص طور پر قابل ذکر

ہیں۔ ذکر میر لکھتے ہوئے سچائی کی بجائے اپنے قائم کردہ معیارات اور مصلحتیں میر کے پیش نظر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'ذکر میر' میں قاری کو وہ بنیادی معلومات بھی نہیں ملتیں جو کہ ہر آپ بیتی کے لیے لازم سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً اپنے خاندان کا شجرہ نسب، دادا کا نام، والدہ کے گھرانے کا تعارف، میر نے نہیں کرایا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ شادی کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟ ایک بیٹے فیض علی کا ذکر ہے لیکن وہ بھی صرف نام کی حد تک۔ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کے بارے میں بھی تشفی بخش بیان نہیں کیا۔ اپنی تعلیم و تربیت، شعر گوئی کا آغاز، اپنی تصانیف، اپنے عہد کی شعری سرگرمیاں اور شعراء کا ذکر بھی موضوع سے خارج رہا۔ جس کی توجیہ بابائے اردو نے 'ذکر میر' کے مقدمے میں اس طرح کی: ''اسے میر صاحب کا ضبط سمجھنا چاہیے۔ یا یہ کہ یہ چیزیں انھوں نے نکات الشعراء کے لیے اٹھا رکھی تھیں۔'' (مقدمہ 'ذکر میر'، ص ۲۰)

بابائے اردو کی ان توجیہات سے قاضی عبدالودود نے سخت اختلاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''میر نے اپنی شاعرانہ بزرگی کا اگر ذکر کیا ہے تو اس طرح سے کہ گویا مسلمات سے ہے جس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مرتب کا یہ خیال کہ میر کا ضبط اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے کہ ذکر میں شعر و شاعری کا برائے نام ذکر ہے۔ کلیات میر کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے قبول نہیں کر سکتے۔ میر اور ضبط نفس کوسوں دور ہیں۔ (عیار بحث ہجویات میر) اس کا دوسرا سبب مرتب نے یہ بتایا ہے کہ ''میر نے یہ چیزیں نکات الشعراء کے لیے اٹھا رکھی تھیں۔'' اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں۔ (الف) نکات کا خاتمہ ۶۵ھ میں ہوا ذکر کا آغاز اس کے بعد ہوا۔ اٹھا رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (ب) نکات میں بہت سی باتیں مجمل ہیں ذکر میں ان کی تفصیل ہو سکتی تھی۔ (ج) نکات میں ۱۱۶۵ھ تک کی بھی بہت سی باتیں درج نہیں، ذکر میں ان کا ذکر ہو سکتا تھا۔ (د) ان تمام نکات کے بعد جو واقعات ظہور میں آئے وہ بیان کیے جا سکتے تھے۔ (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۵۰-۵۱)۔ بابائے اردو نے 'ذکر میر' کو تاریخی اعتبار سے بھی مسلّم قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''اس زمانے کی تاریخ کے لیے یہ کتاب بھی ایک حیثیت رکھتی ہے۔ بعض مقامات پر وہ مورخ کی حیثیت سے رائے بھی دیتے ہیں۔'' (مقدمہ 'ذکر میر'، ص ج)

قاضی عبدالودود نے بابائے اردو کی اس رائے کو بھی رد کیا ہے: ''ذکر میر تاریخی حیثیت سے چنداں اہم نہیں۔ بعض دوسرے اور تیسرے درجے کے اشخاص کے متعلق کچھ جزئی باتیں جو دوسری جگہ نہیں ملتیں البتہ ذکر میں ہیں۔ میر کی رایوں میں تناقض ہے۔۔۔ میر سنین مطلقاً نہیں

دیتے۔ واقعات کی تاریخی ترتیب لازماً ملحوظ نہیں رکھتے۔۔۔ان سب پر طرہ یہ کہ ان کے یہاں غلط بیانیاں بھی ہیں۔مرتب کا فرض تھا کہ اگر ان کے خیال میں کوئی تاریخی گتھی ذکر سے سلجھتی ہے، تو اس کا ذکر کرتے۔حتی الامکاں واقعات کے سنین درج کرتے، مجمل ومبہم بیانات کی توضیح اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتے۔انھوں نے ان امور کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی اور عہدِ میر کی تاریخ سے بے خبری کے باعث خود ان سے مقدمے یا عنوانات متن میں فاحش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص۵۱-۵۲)

مولوی عبدالحق نے 'ذکرِ میر' کی تدوین دو نسخوں (نسخہ اٹاوہ+نسخہ لاہور) کی مدد سے کی۔جن میں سے ایک نسخہ (نسخہ اٹاوہ) کو بنیاد بنایا اور دوسرے نسخے (نسخہ لاہور) کے اختلافات حواشی میں درج کیے جب کہ قاضی عبدالودود معترض ہیں کہ ان نسخوں کے علاوہ ذکرِ میر کے مزید نسخے بھی بابائے اُردو کے علم میں تھے لیکن انھوں نے ان کے حصول کے لیے کوئی کاوش نہیں کی حالاں کہ "مرتب کا فرض اولین صحیح وجامع متن پیش کرنا ہے اور یہ مستثنیٰ حالات سے قطع نظر، کتاب زیرِ ترتیب کے متعدد نسخوں کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔ڈاکٹر عبدالحق کو ۱۹۲۶ء میں یا اس کے کچھ ہی بعد یہ معلوم ہو چکا تھا کہ 'ذکرِ میر' کا ایک نسخہ جناب سید مسعود حسن رضوی کے پاس ہے لیکن اور نسخوں کی تلاش درکنار انھوں نے اس نسخے سے استفادہ بھی غیر ضروری متصور کیا۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص۷۹-۸۰)

چوں کہ مولوی عبدالحق نے نسخہ اٹاوہ کو بنیادی نسخہ بنا کر 'ذکرِ میر' کی تدوین کی لہٰذا 'نسخہ لاہور' میں اگر کوئی لفظ درست ہے اور نسخہ اٹاوہ میں غلط لکھا ہوا ہے تو بھی بابائے اُردو نے نسخہ لاہور کے صحیح لفظ کو متن میں جگہ دینے کی بجائے حواشی میں ہی لکھا اور مقدمے یا حواشی میں متن کے کسی لفظ یا عبارت کو غلط یا مشتبہ نہیں بتایا۔ایسی صورت میں پڑھنے والے یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرتب کے نزدیک 'ذکرِ میر' مطبوعہ کا ایک ایک لفظ صحیح ہے لیکن قاضی عبدالودود کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ان کے نزدیک: "(ذکرِ میر مرتبہ مولوی عبدالحق) کا متن مختلف الانواع اغلاط سے مملو ہے۔املا کا جہاں تک تعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب اس کے متعلق کسی قاعدے کے پابند نہیں۔" (عبدالحق بحیثیت محقق، ص۸۳)

قاضی صاحب نے اپنے مقالے میں 'ذکرِ میر' مرتبہ مولوی عبدالحق کے متن کے غلط یا مشتبہ الفاظ اور عبارات کی طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔'ذکرِ میر' کے آخر میں میر نے کچھ

لطائف بھی درج کیے تھے۔ جنہیں بابائے اُردو نے متن سے خارج کردیا کیوں کہ ان کے نزدیک:
''بعض ان میں سے ایسے فحش ہیں کہ ان کا لکھنا یا بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس سے اس زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے ورنہ میر صاحب کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا ہے۔'' (مقدمہ، ذکرِ میر، ص ق)

اسی بنا پر قاضی عبدالودود معترض ہیں کہ ''مرتب نے ذکر (ذکرِ میر) کا مکمل متن پیش نہیں کیا۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۸۰) حالاں کہ تدوینِ متن کی بنیادی روح مصنف کا مکمل متن تصحیح و ترتیب کے بعد شائع کرنا ہے۔ مصنفِ اصلی کے متن میں کانٹ چھانٹ کرنا، یا اس میں ترمیم، تخفیف یا اضافہ کرنا مرتب کا کام نہیں ہے بلکہ مرتب و مدون کا کام یہ ہے کہ مصنفِ اصلی کے متن میں اگر کاتب کی غلطی سے یا کسی اور وجہ سے کچھ الحاقی کلام شامل ہو گیا ہے تو اس کی نشان دہی کرے اور متن کے ایک ایک حرف کے بارے میں مستند حوالوں سے یہ یقین بہم پہنچائے کہ مذکورہ حرف، لفظ یا عبارت مصنفِ اصلی کے قلم سے ہی نکلی ہے جب کہ اس کے برعکس مولوی عبدالحق نے مصنف کے متن کو تحقیقی و تنقیدی نظر سے پرکھنے کی بجائے اپنی مرضی سے متن کے ایک حصے کو غیر متعلق قرار دے کر متن سے خارج کردیا جو کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح وہ خود اپنی رائے کو مصنف کی رائے پر ترجیح دے رہے ہیں۔ قاضی عبدالودود کے نزدیک: ''یہ کہنا کہ لطائف سے میؔر کے زمانے کا ذوق معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ میر۔۔۔ کی تہذیب اور متانت کا کیا کہنا'' بے معنی سی بات ہے۔ لطائف کے اندراج پر وہ مجبور نہیں کیے گئے تھے، یہ خود ان کے ذوق کا تقاضا تھا جس کی بدولت لطائف شاملِ کتاب ہوئے۔ ''میر کی تہذیب اور متانت'' کی تعریف مشاعروں کی تحسین سے زیادہ وزن نہیں رکھتی۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۸۱)

'لطائف' ذکرِ میر سے خارج کرنے کے ساتھ ساتھ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے متن کے مضامین میں اُردو عنوانات کا اضافہ بھی کیا۔ (مقدمہ، ذکرِ میر، ص ق) جن میں سے بہتیرے غلط یا ناکافی ہیں (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۸۴) مولوی عبدالحق نے 'ذکرِ میر' کا سالِ تصنیف ۱۱۹۷ھ متعین کیا ہے ان کے نزدیک کتاب کا نام ذکرِ میر تاریخی نام ہے جس کے عدد ۱۱۷۰ ہیں اس میں ۲۷ ملائے تو ۱۱۹۷ھ ہوئے۔ (مقدمہ، ذکرِ میر، ص ف) جب کہ قاضی عبدالودود نے 'ذکرِ میر' کے نسخہ لاہور (جو مولوی صاحب نے پروفیسر محمد شفیع وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور سے حاصل کیا) کی رو سے یہ ثابت کیا کہ 'ذکرِ میر' کا سالِ تصنیف ۱۱۸۶ھ ہے (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۳)۔ انھوں نے پروفیسر محمد شفیع کے نام خط لکھ کر اصل حقائق معلوم کیے۔ پروفیسر محمد شفیع مذکورہ خط میں

لکھتے ہیں: ''ذکرِ میر کا میرا نسخہ بتاریخ ۲۶ ربیع الاول ۱۰ جلوس اکبر ثانی مطابق بیست وہفتم فروری ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) تحریر ہوا۔ اختتام کتاب کا قطعۂ تاریخی اس میں ہے۔۔۔ ساٹھ برس کے ہو جانے کا جو ذکر مطبوعہ نسخے میں ہے وہ میرے قلمی نسخے میں نہیں۔ اس کی بجائے پنجاہ برس کے ہو جانے کا ذکر ہے۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۳)

قاضی عبدالودود نے قطعہ تاریخ سے سال تصنیف ۱۱۸۶ھ نکالا ہے۔ لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر عبدالحق کے مرتبہ نسخے میں نہ یہ بات مرقوم ہے کہ نسخہ لاہور میں عمر ۶۰ کی جگہ ۵۰ لکھی ہے اور نہ یہ کہ اس میں قطعہ کی جو شکل ہے وہ ۱۱۸۶ھ پر مشعر ہے اتنے اہم اختلافات کا قلم انداز ہونا حیرت انگیز ہے۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۱۳) جب کہ نسخۂ لاہور کے متعلق بابائے اُردو کی رائے یہ ہے کہ ''پروفیسر صاحب کا نسخہ ایسا اچھا لکھا ہوا نہیں ہے جیسا اٹاوے کا ہے اور ناقص بھی ہے یعنی ایک چوتھائی سے زائد کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آخری حصہ میر صاحب نے بعد میں بڑھایا ہے چناں چہ لکھنؤ جانے کا حال لاہور کے نسخے میں مطلق نہیں ہے۔'' (مقدمہ، ذکرِ میر، ص ق)

لیکن نسخۂ لاہور میں حسام الدولہ کی اسیری کا ذکر ہے جو ۱۱۸۷ھ کا واقعہ ہے۔ ''کتاب بے شبہ ۸۶ھ میں ختم کر دی گئی تھی حسام الدین خاں کی قید کا واقعہ بعد کو اضافہ کیا اور بے احتیاطی کی وجہ سے قطعہ اپنے حال پر رہنے دیا۔ اس کے بعد ذکر میں جو کچھ ہے وہ لکھنؤ میں ۱۱۹۶ھ تا ۱۱۹۷ھ میں اور کچھ اس کے بعد لکھا گیا۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق، ص ۲۰)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۱۹۷ھ 'ذکرِ میر' کا سال تصنیف متعین کرنے کے بعد مولوی عبدالحق 'انتخاب کلامِ میر' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ''نکات الشعراء ذکرِ میر سے بہت بعد لکھی گئی ہے۔'' (مقدمہ، ص ۸) اور 'نکات الشعرا' کی داخلی شہادتوں سے مولوی صاحب نے اس کا سالِ تصنیف ۱۱۶۵ھ متعین کیا ہے۔ (مقدمہ، ص ۵)

یہی صورت حال 'دریائے لطافت' (انشاء اللہ خاں انشاء) کی تدوین میں بھی نظر آتی ہے۔ انشاء نے دریائے لطافت کی تکمیل ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷ء میں کی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے: دریائے لطافت، باب سوم، ص) جب کہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'دریائے لطافت' (مقدمہ طبع اول، ص ع) کا سال تصنیف ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۶ء لکھا ہے جب کہ مولوی عبدالحق کی مرتبہ 'دریائے لطافت' کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۵ء میں مترجم پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے 'دریائے لطافت' کا سنہ تصنیف انیسویں صدی کا آٹھواں برس قرار دیا ہے (مترجم کا دیباچہ، ص

ص) دوسرے ایڈیشن میں مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا طبع اول ۱۹۱۶ء کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس ایڈیشن کے لیے مولوی عبدالحق نے ''دیباچہ مرتب بر طبع ثانی'' کے عنوان سے تین صفحات پر مشتمل نیا مقدمہ بھی لکھا جس میں انھوں نے دریائے لطافت کو ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء کی تصنیف قرار دیا ہے۔ (ص د)

'ذکرِ میرؔ' کی طرح مولوی عبدالحق نے 'دریائے لطافت' کے متن میں بھی حذف اور اضافہ سے کام لیا ہے۔ 'دریائے لطافت' کی تدوین انھوں ۱۸۴۹ء میں مرشد آباد سے شائع ہونے والے نسخے کی مدد سے کی جس کی تصحیح و ترتیب مولوی احمد علی گوپاموی نے کی تھی۔ یہ نسخہ فارسی نستعلیق ٹائپ میں شائع ہوا تھا۔ بابائے اُردو نے بھی ۱۹۱۶ء میں 'دریائے لطافت' کا فارسی متن ہی شائع کیا۔ البتہ اس کی تصحیح و ترتیب کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے 'دریائے لطافت' کے متن میں موجود فحش کلمات حذف کر دیئے لیکن ایسا کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کوئی بھی لفظ حذف کرتے ہوئے یا تبدیل کرتے ہوئے متن کے معانی و مطالب پر اس کا اثر نہ پڑے۔ مقدمے میں لکھتے ہیں: ''جابجا فحش کلمات بے تکلف استعمال کیے گئے ہیں اس لیے ان کے خارج کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی کیوں کہ بعض اوقات مطلب خبط ہو جاتا تھا۔'' (مقدمہ، دریائے لطافت، ص ص)

انشاء نے 'دریائے لطافت' میں حروف تہجی کے نام بھی نئے ایجاد کیے تھے۔ نواب سعادت علی خاں جن کی فرمائش پر انشاء نے یہ کتاب لکھی ان کے اوصاف کی رعایت سے حروف تہجی کے نئے نام مرتب کیے۔ مثلاً 'الف' کو اقبال 'ب' کو بخشش، 'پ' کو پاکی طینت، 'ت' کو ترحم، 'خ' کو خدا ترسی، 'ژ' کو ژرف نگاہی، 'ک' کو کم دماغی، 'ہ' کو ہمت بلند لکھا ہے۔ (مقدمہ، دریائے لطافت، ص ص، طبع اول) جب کہ بابائے اُردو نے 'دریائے لطافت' کی تدوین کرتے ہوئے انشاء کے متعین کیے ہوئے حروف تہجی حذف کر دیئے اور حروف تہجی کی مروجہ صورت کو 'دریائے لطافت' کے تصحیح شدہ متن کا جزو بنایا اور مقدمے میں اس کا جواز پیش کیا کہ ''اس سے پڑھنے والے کو بڑی الجھن ہوتی ہے مثلاً 'کھن' ایک چھوٹا سا لفظ ہے۔ اس کا تلفظ وہ اس طرح بتاتے ہیں ''با کم دماغی مفتوح با ہمت بلند یکی گشتہ و نفاست ساکن بمعنی کا ہے'' اور چوں کہ کتاب میں مختلف تقریریں اور مختلف بولیاں درج ہیں وہ ایک ایک لفظ کا تلفظ اس طریقہ سے بتاتے ہیں تو پڑھنے والے کو سخت پریشانی ہوتی ہے اس لیے میں نے اس طریقہ کو بھی ترک کر دیا ہے اور مروجہ اور معمولی

طریقہ کو اختیار کیا ہے تا کہ ناظرین کو سہولت ہو۔'' (مقدمہ، دریائے لطافت، طبع اول، ص ص۔ ع)

۱۹۳۵ء میں بابائے اُردو نے 'دریائے لطافت' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔اس دوسرے ایڈیشن میں 'دریائے لطافت' کے متن کا سادہ اور بامحاورہ اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا۔یہ ترجمہ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے کیا اور مختلف مقامات پر مفید حواشی بھی لکھے، دیباچے میں لکھتے ہیں: ''میں نے ترجمے میں یہ کیا ہے کہ کتاب کے مطالب کی تقسیم کو تو جوں کا توں رہنے دیا لیکن اصل فارسی کتاب میں دریا کی رعایت سے عنوانوں کے نام جو جزیرہ اور شہر وغیرہ کی شکل میں تھے ان کی جگہ صرف باب اور فصل استعمال کیے ہیں اور کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا۔حواشی کے سوا متن میں ضرورت پر خطوط وحدانی مستقیم کے اندر جو درج ہے وہ میرا ہے قوسین کے اندر کے الفاظ متن سے ماخوذ ہیں۔پڑھنے والوں کو آسانی کی غرض سے میں نے یہ بھی کیا ہے کہ ایک فصل میں جہاں مضمون بدلا ہے یا موضوع کی اہم تفصیل وغیرہ وارد ہوئی ہے وہاں دو خطوں سے الگ کر کے سرخی دے دی ہے۔'' (مترجم کا دیباچہ، ص ق)

ڈاکٹر آمنہ خاتون نے 'دریائے لطافت' کے فارسی اور اُردو متن کا تقابلی مطالعہ کر کے پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی کے ترجمے میں بہت سی اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔بعض اغلاط ایسی بھی ہیں جن سے مصنف کا مفہوم خبط ہو جاتا ہے۔

> ''انشاء کی معرکہ آراء اور عدیم النظیر تصنیف 'دریائے لطافت' ہے انجمن ترقی اُردو۔۔۔نے۔۔۔اس کا اُردو ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔میں نے انشاء کے متعلق اپنا مطالعہ اسی ترجمہ سے شروع کیا تھا لیکن جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا گیا انشاء کی لسانی قابلیت اور قواعد دانی۔۔۔پر میرے شبہات بڑھتے گئے۔۔۔لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اُردو ترجمے کا اصل فارسی سے مقابلہ کیا۔'دریائے لطافت' کے افہام و تفہیم میں اس ترجمے سے صدہا مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔۔۔بہت سی فاش غلطیاں اس لیے پیش کر دی ہیں کہ 'دریائے لطافت' کے اُردو ترجمے کو پڑھ کر کوئی 'اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنے والا' یہ دھوکا نہ کھا جائے کہ وہ انشاء کی تحقیقات سے مستفید ہو رہا ہے۔'' [۶۷]

'دریائے لطافت' کے مقدمہ میں بابائے اُردو نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ 'دریائے

لطافت' کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی پہلی اُردو قواعد ہے۔''یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اُردو صرف ونحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع اور بے مثال کتاب ہے۔ اُردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔'' (مقدمہ، دریائے لطافت، طبع اول، ص ط)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو بابائے اُردو کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اُردو کی پہلی قواعد ۱۸۴۰ء میں سرسید احمد خان نے 'قواعد صرف ونحو اُردو' کے نام سے لکھی[۶۸]۔ چوں کہ 'دریائے لطافت' فارسی زبان میں لکھی گئی تھی اس لیے مسعود حسین خاں کو اسے اُردو کی پہلی قواعد ماننے میں تامل ہے۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے بھی دستور الفصاحت کے مقدمے میں 'دریائے لطافت' کو ہندوستانیوں کی سب سے پہلی قواعد اُردو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے دستور الفصاحت کی تالیف کا کام 'دریائے لطافت' سے قبل ہی شروع کر دیا گیا تھا اور غالباً اس سے قبل ہی انجام بھی پا گیا تھا مگر انشاء کی خوش بختی کہ اس کی کتاب تمام ہو کر ملک بھر میں پھیل گئی اور یکتا کی بدقسمتی کہ اولاً تو برسوں کے بعد مسودہ صاف کرنے کی مہلت ملی۔ ثانیاً مسودہ صاف ہو کر بھی ۱۹۳۹ء تک گوشہ گمنامی سے باہر نہ آ سکا[۶۹]۔ عبدالرؤف عروج نے بھی ۱۹۶۲ء میں مولوی عبدالحق مرتبہ 'دریائے لطافت' کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ایک مترجم کی حیثیت سے متن پر مکمل توجہ دینے کی بجائے انھوں نے بھی اس کے متن کے کچھ حصوں کو ناکارہ سمجھ کر حذف کر لیا۔

''اس کے بعد انشاء نے علم صرف پر بحث کی ہے۔ یہ ہمارے لیے ضروری نہیں ہے اس موضوع پر ہماری زبان میں صدہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دریائے لطافت کا یہ حصہ اپنی حیثیت میں بڑی حد تک نامکمل اور ناتمام ہے۔ اس حصہ کا اطلاق ہماری موجودہ طرز تحریر وتقریر پر مشکل ہی سے ہوگا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔''[۷۰]

ان کا اصرار یہ ہے کہ

''مترجم نے جتنی باتیں نظر انداز کی ہیں وہ یقیناً اس قابل تھیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے۔ محض اس وجہ سے کہ انھیں انشاء جیسے مسلم الثبوت

صاحب کلام اور زبان داں نے لکھا ہے۔ اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا ایک
گھناؤنی قسم کی روایت پرستی ہے۔ اس روایت پرستی کے باعث زبان نہ
پھولتی ہے نہ پنپ سکتی ہے۔ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ہمیں محض افکار
عالیہ ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اجتہاد سے بھی کام لینا چاہیے۔" [۷۱]

کتاب کے اختتامیہ میں عبدالرؤف عروج نے مولوی عبدالحق کے اس دعوئی کو بھی باطل قرار دیا ہے کہ 'دریائے لطافت' اردو صرف ونحو کی پہلی کتاب ہے۔ ان کی رائے میں دریائے لطافت کی موجودگی سے پہلے دستور الفصاحت کا وجود ملتا ہے۔

"یہاں مولوی عبدالحق سے یقیناً چوک ہوئی۔ ان سطور کے لکھتے وقت ان
کے ذہن میں یہ بات مطلق نہیں رہی کہ کل کی ریختہ اور آج کی اُردو میں
زمین وآسمان کا فرق ہے۔ آج کی اُردو کا زیادہ تر سرمایہ عربی اور فارسی
لغات کا پابند ہے اور وہ اپنے مزاج میں ہندی نژاد ہونے کے باوجود بڑی
حد تک ترکیبی اور ہیئتی سطح پر فارسی کے قریب آ گئی ہے۔۔۔ دریائے
لطافت کے موضوع پر احمد علی یکتا نے بھی ایک کتاب دستور الفصاحت
کے نام سے لکھی تھی۔۔۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ
انشاء کی دریائے لطافت سے پہلے کی تصنیف ہے۔" [۷۲]

میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' مولوی عبدالحق نے ۱۹۲۶ء میں مدون کی۔ مقدمے میں میر اثر اور 'خواب وخیال' کی مبالغہ آمیز انداز میں مدح سرائی کی اور 'خواب وخیال' کو اُردو کی صف اول کی مثنوی قرار دیا۔ "جدید اُردو زبان کی جب سے بنیاد پڑی ہے شاید ہی کوئی مثنوی زبان کی سلاست اور روانی، فصاحت اور شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی اور زنانے اور مردانے محاوروں کے بے تکلف استعمال میں مثنوی خواب وخیال کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" (مقدمہ، 'خواب وخیال'، ص ج۔د) مولوی عبدالحق کے اس دعوئی سے ناقدین اور محققین نے شدت سے اختلاف کیا۔ حبیب احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"یہ مثنوی اول درجہ کی مثنویوں میں جگہ پانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ اس
میں نہ کوئی قصہ ہے نہ بیان میں شاعری، ہیرو کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ
نہایت بھونڈی ہے اگر اس کی زبان سے قصہ بیان کرانا منظور تھا تو

ابتدائے قصہ میں اس کی دیوانگی اور خود رفتگی کے انتہائی مدائح قلم بند نہیں کرنے تھے۔ اس مثنوی کی مثال ایسی ہے کہ ایک میانہ قد شخص کسی قدر مضحکہ خیز اور بھیانک معلوم ہوگا جس طرح پوشاک کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو پہنانا منظور ہو اس کے ناپ کی سی جائے۔ اسی طرح ایک قصہ کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ جس قسم کے افراد پیش کرنے منظور ہوں اس کی صفات بیان کی جائیں مگر اس مثنوی میں اس بات کا ذرا بھی خیال نہیں کیا گیا ہے۔ عشق و ہجر کا ذکر ہے تو جتنے خیالات اچھے برے، خوشنما اور بھونڈے شاعر کے ذہن میں آتے گئے سب کو قلم بند کردیا۔" [۷۳]

مولوی عبدالحق کے نزدیک میر اثر بزرگ اور بزرگ زادے تھے۔ درویشی ان کا شعار تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے مثنوی خواب وخیال میں بعض مقامات پر کھلی کھلی باتیں لکھ دی ہیں جس پر مولوی عبدالحق نے تعجب کا اظہار کیا ہے: "اگرچہ اس مثنوی میں ایک آدھ مقام ایسا آگیا ہے جہاں حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ دیا ہے مگر میر اثر کی زندگی ایسی پاک صاف اور درویشانہ تھی کہ اس پر کسی کا وہ گمان نہیں ہوسکتا جو شوق کی مثنویاں پڑھ کر ہوتا ہے۔" (مقدمہ 'خواب وخیال' ص ف) لیکن حقیقت یہ ہے کہ وصل کی مختلف منازل کا بیان میر اثر نے بڑی تفصیل سے مزے لے لے کر کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے شوق اور میر اثر کی مثنویوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اثر اور شوق کے بعض اشعار بالکل مشابہ ہیں اور خواب وخیال میں وصل کا بیان شوق کی 'بہار عشق' سے کم نہیں کچھ زیادہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"گستاخی ہوتی ہے لیکن وصل کے کوک شاستری بیان کے بعد میر اثر کو صوفی صافی ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں دوسروں کی رائے پر بار کیا جائے یا ان کے الفاظ پر۔۔۔ یہ عریانی ترحم انگیز ہے اس سراپا میں شدید جنسی بھوک کا احساس ہوتا ہے۔" [۷۴]

مجنوں گورکھپوری نے تو یہاں تک لکھا کہ "معلوم ہوتا ہے کوئی لچا بدمست ہو کر کھل کھیلا ہے۔" [۷۵] ڈاکٹر گیان چند جین درج ذیل وجوہات کی بنا پر میر اثر کی خواب وخیال کو صف اول کی مثنویوں میں شمار کرنے سے گریزاں ہیں: "اس میں نہ ربط کلام ہے نہ حسن تعمیر۔ اس میں بے جا

طول و اطناب اور تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا موضوع تین ہزار اشعار کا حامل نہ تھا اگر اثر اختصار سے کام لیتے۔ غزلوں کی بھر مار نہ کرتے جن سے تسلسل کا خون ہوتا ہے۔ پردہ کی باتیں پردے ہی میں چھوڑ دیتے اور مثنوی کو اپنے گھٹے ہوئے جذبات کی نکاسی کا وسیلہ نہ بنا لیتے تو اس مثنوی کا پایہ بلند ہوتا۔ بہ حالت موجودہ اسے صف اول کی مثنوی قرار نہیں دیا جاسکتا۔'' [۷۶]

کلیم الدین احمد کے نزدیک خواب وخیال کی سب سے بڑی خامی ''دلچسپی'' کی کمی ہے۔ لکھتے ہیں:

''مثنوی خواب وخیال میں نہ مسلسل قصہ ہے اور نہ کہیں سیرت نگاری اور اس لحاظ سے وہ اُردو کی مشہور مثنویوں سے کم پایہ ہے۔ اس مثنوی میں قوت تعمیر کا بھی کامل فقدان ہے لیکن اصل خامی دلچسپی کی کمی ہے اور اس خامی کا عبدالحق کو احساس نہیں۔ اگر اس مثنوی کو ایک مجلس میں شروع سے آخر تک پڑھا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی تھوڑی دیر بعد طبیعت اکتا جائے گی۔۔۔۔ اس مثنوی کی مثال بھڑوں کی بھنبھناہٹ کی سی ہے جو تھوڑی دیر تک خوشگوار معلوم ہوتی ہے لیکن دیر تک سننے سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔'' [۷۷]

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں: ''اسے اردو کی تمام مثنویوں پر فوقیت دینا حقیقت پر رنگ و روغن چڑھانا ہے۔'' [۷۸] ڈاکٹر گیان چند نے البتہ یہ تسلیم کیا ہے کہ اپنے زمانے کے لحاظ سے 'خواب وخیال' کی زبان زیادہ صاف اور شستہ ہے اور اس خوبی کی تمام تر وجہ اس مثنوی میں موجود غزلیں ہیں جن کی بنا پر انھوں نے اس مثنوی کو ایک طویل غزل قرار دیا ہے۔

''اس مثنوی میں تقریباً نصف حصہ غزلوں کا ہے یعنی ۱۱۲ غزلیں اور قطعات ہیں اور ایک طویل ترجیع بند ہے۔ تقریباً ایک تہائی اشعار فارسی ہیں۔ غزلیں اُردو کی بھی ہیں اور فارسی کی بھی۔۔۔ مثنوی 'خواب وخیال' کو ایک طویل غزل کہنا مثنویات میر سے زیادہ صحیح ہے۔'' [۷۹]

'خواب وخیال' میں میر اثر نے سراپا نگاری بھی کی۔ ۱۳۰۹ اشعار کا مفصل سراپا لکھا۔ مولوی عبدالحق میر اثر کی سراپا نگاری کی تعریف بھی رطب اللسان ہیں۔ ''سراپا ہماری شاعری میں ایک پامال مضمون ہے اور اس کی تشبیہیں اور استعارے اس قسم کے ہیں کہ بعض اوقات مضمون

مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ تاہم انھوں نے اس میں خوب شعر نکالے ہیں سراپا کے لیے زیادہ تر فارسی تشبیہیں استعمال کی جاتی ہیں مگر میراثر نے کہیں کہیں ہندی تشبیہوں سے بھی کام لیا ہے۔" (مقدمہ 'خواب وخیال'، ص ک) جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین کے نزدیک:

"اس سراپا میں شدید جنسی بھوک کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ ان کا سراپا طویل ہے لیکن تصنع آمیز اور روایتی انداز کا ہے۔ اس میں کوئی خاص لطف نہیں۔" [۸۰]

سراپا نگاری میں شعراء ہمیشہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں لیکن اس مبالغہ آرائی کا مقصد اشعار میں لطافت کا اضافہ کرنا ہوتا ہے تا کہ لفظوں میں ایک دلنشین زندہ اور متحرک تصویر مجسم کی جا سکے لیکن خواب وخیال کی مبالغہ آرائی بقول حبیب احمد صدیقی:

"ہرگز کسی لطافت کا پتہ نہیں دیتی (دیتا)۔ اگر اُردو کی ترقی کا دارومدار ایسے ہی ادبِ لطیف پر ہے تو ہمیں اس کی ترقی کی طرف سے مایوس ہو جانا چاہیے۔" [۸۱]

'خواب وخیال' کے بعد بابائے اُردو نے میراثر کا دیوان بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ 'دیوان اثر' کی تدوین بابائے اُردو نے دو نسخوں (نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور نسخہ کتب خانہ آصفیہ) کی مدد سے کی۔ ان دو نسخوں میں سے انھوں نے نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بنیاد بنایا کیوں کہ یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کے مقابلے میں طویل بھی تھا اور مکمل بھی۔ ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے میراثر کا دیوان مدون کیا تو انھوں نے بھی بابائے اُردو کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نسخے کو بنیاد بنایا حالاں کہ اس نسخے کے علاوہ ان کے پاس تین قلمی اور دو مطبوعہ نسخے دیوان اثر کے اور بھی موجود تھے لیکن اس کے باوجود بابائے اُردو کے مرتبہ دیوان اثر اور فضل حق کامل قریشی کے مرتبہ دیوان اثر کی غزلیات اور دیگر اصناف شعر کی تعداد میں واضح فرق موجود ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نسخے میں کئی مقامات پر اشعار کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ یعنی رباعی کے ذیل میں قطعے اور فردیات بھی موجود ہیں۔ جس طرف بابائے اُردو نے توجہ نہیں دی۔ اس کے علاوہ بابائے اُردو کے مرتبہ 'دیوان اثر' میں ناموزوں اشعار کی بھی بہتات ہے۔ جن کی نشان دہی فضل حق کامل قریشی نے 'دیوان اثر' کے اختلاف نسخ میں تفصیل سے کی ہے۔

ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی نے بابائے اُردو کے مرتبہ 'دیوان اثر' اور ان سے ایک سال پہلے ۱۹۲۹ء میں شائع ہونے والا دیوان اثر، مرتبہ تقی الدین احمد کے تقابلی مطالعے کے بعد ترتیب و تدوین کے لحاظ سے دونوں مطبوعہ نسخوں کے متون میں موجود اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ترتیب و تدوین کے اعتبار سے بھی دونوں میں خامیاں موجود ہیں، املا کی غلطیوں کے علاوہ بعض مصرعے ناموزوں ہیں، رباعی و قطعہ کا فرق نہیں ہے۔ فردیات اور غزل ناتمام کے اشعار بھی رباعیات کے ذیل میں موجود ہیں۔ ردیف وار ہونے کے باوجود دونوں میں ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ غرض یہ کہ تقی الدین احمد اور مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ نسخے اغلاط کے اعتبار سے یکساں حالت میں ہیں۔'' [۸۲]

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے 'میر اثر' کی مثنوی 'خواب و خیال' اور دیوان مرتب کیا لیکن میر اثر کی پیدائش، وفات، سوانحی حالات، خاندانی حالات و واقعات پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی جس کا انھیں افسوس بھی تھا۔ مقدمے میں اس کا اظہار بھی کیا: ''افسوس کہ اثر کے حالات کہیں نہیں ملتے۔'' (مقدمہ 'دیوان اثر'، ص ۲) لیکن فضل حق کامل قریشی نے تقریباً چالیس اُردو اور فارسی کے ایسے تذکروں کی نشان دہی کی ہے جن میں اثر کا ذکر اور کلام موجود ہے۔ بیاضیں اور دیگر تحقیقی و تنقیدی مضامین اس کے علاوہ ہیں۔

دیوان اثر کے علاوہ بابائے اُردو نے تاباں دہلوی کا دیوان بھی مرتب کیا۔ میر اثر کی طرح تاباں دہلوی کے سوانحی حالات مرتب کرنے کے سلسلے میں بھی بابائے اُردو نے کوئی کاوش نہیں کی۔ تاریخ پیدائش کا تعین نہیں کیا لیکن تاریخ وفات کے سلسلے میں قیاس کرتے ہیں: ''تاباں کا انتقال ۱۱۶۱ھ اور ۱۱۶۵ھ کے درمیان ہوا۔'' (مقدمہ 'دیوانِ تاباں'، ص د) بابائے اُردو نے 'دیوان تاباں' کی تدوین تین قلمی نسخوں کی مدد سے کی لیکن نسخوں کا تفصیلی تعارف مقدمے میں نہیں کرایا اور نہ ہی یہ وضاحت کی کہ دیوان کی تدوین کرتے ہوئے انھوں نے کس نسخے کو بنیاد بنایا۔ دیوان تاباں مرتبہ بابائے اُردو کے کچھ اشعار کے دوسرے مصرعے اور کچھ مصرعوں کے چند الفاظ محذوف ہیں۔ ان خالی جگہوں پر بابائے اُردو نے نقطے لگا دیے ہیں لیکن حواشی میں اپنے اس اقدام کی کوئی وضاحت نہیں کی۔

بابائے اردو نے دیوان تاباں کے مقدمے میں تاباں کے تلمذ کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تاباں درحقیقت 'حشمت' کے شاگرد تھے۔ تاباں نے اپنے استاد کی شان میں ایک مثنوی بھی لکھی۔ ان کی تاریخ وفات بھی لکھی اور وفات پر ایک مرثیہ بھی لکھا۔ سات اشعار کی ایک غزل بھی کہی جس کی ردیف ہی 'حشمت' ہے۔ غرض تاباں نے اپنے دیوان میں بار بار حشمت کا ذکر کیا لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ثابت کیا ہے کہ تاباں اور حشمت کی یکجائی اور شاگردی واستادی صرف دو سال کے عرصے پر محیط ہے۔[۸۳]

ابتدا میں وہ حاتم کے شاگرد تھے جس کا اعتراف تاباں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے حاتم نے بھی دیوان زادہ میں تاباں کی شاگردی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''تاباں کے مطبوعہ دیوان (دیوان تاباں، مرتبہ مولوی عبدالحق) میں حاتم کی جگہ حشمت کا لفظ ملتا ہے جو اس وقت کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے جب تاباں نے حاتم سے ناراض ہوکر یا کسی اور وجہ سے حشمت کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ دیوان زادہ میں تاباں کی زمین میں ۱۱۵۳، ۱۱۵۶، ۱۱۵۸ اور ۱۱۵۹ھ کے تحت چار غزلیں ملتی ہیں۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء کے لگ بھگ تاباں نے حاتم سے مشورۂ سخن بند کر کے محمد علی حشمت سے رشتہ شاگردی استوار کرلیا تھا۔۔۔ ایک رباعی میں تاباں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ دو سال تک یکجا رہے۔ وہ رباعی یہ ہے

ہم کو تمہارے غم میں جینا ہے محال	تم ہم کو لکھو کہ ہے تمہارا کیا حال
دو سال جو ہم تم رہے یک جا حشمت	اب اس کے عوض ہجر کا ہے روز ہی سال [۸۴]

'قطب مشتری' کی تدوین مولوی عبدالحق نے دو مخطوطات کی مدد سے کی۔ ایک نسخہ ان کی ذاتی ملکیت ہے اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری کا جس کی نقل بھی انھوں نے منگا لی تھی۔ 'قطب مشتری' کی تدوین کرتے ہوئے انھوں نے اسی نسخے کو بنیاد بنایا اور اپنے ذاتی نسخے کو ثانوی حیثیت دی اور اس کے اختلافات حواشی میں درج کیے۔ مولوی صاحب کے ذاتی نسخے میں بعض بیانات زائد بھی تھے جو کہ انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں موجود نہیں تھے۔ ان کو کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کیا۔ مقدمہ لکھتے ہوئے مولوی صاحب سے معمولی سا سہو ہوا کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کے بجائے 'برٹش میوزیم لائبریری' لکھ دیا لیکن مطبوعہ متن کے حاشیے میں انڈیا آفس لائبریری کا حوالہ ہی درج ہے۔ اس سہو کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے 'تذکرہ مخطوطات' جلد سوم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولوی صاحب نے 'قطب مشتری' کی

تدوین کرتے ہوئے انڈیا آفس کے نسخے کو سامنے رکھنا تو درکنار اسے دیکھا بھی نہیں اور نہ ہی اُن کے پاس اس نسخے کا عکس تھا۔ لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالحق صاحب کا نسخہ اتنا صحیح نہ تھا یا اُس کو اُنہوں نے غلط پڑھا تھا تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ انڈیا آفس کے نسخے کا عکس بھی منگوایا تھا اور اس سے بھی اپنے نسخے کی تصحیح کی تھی۔ اسی نسخے کا ذکر انھوں نے اپنے مقدمے میں برٹش میوزیم کے نسخے کے نام سے کیا ہے (ص ۱۸) اور متن کتاب میں اسی کو انڈیا آفس کا نسخہ (ص ۱۴) لکھا ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے لندن کا نسخہ دیکھا ہی نہیں۔ اگر وہ دیکھتے یا اُس کا عکس منگواتے تو ابیات مندرجہ بالا کی غلطیوں کے علاوہ حسب ذیل امور میں بھی اختلاف باقی نہ رہتا۔۔۔۔ مولوی صاحب نے یہاں نوٹ نہیں دیا کہ یہ بیتیں انڈیا آفس کے نسخے میں نہیں ہیں جس سے یہ شبہ یقین کو پہنچتا ہے کہ انھوں نے وہ نسخہ یا اُس کا عکس نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔ اگر وہ انڈیا آفس کا نسخہ دیکھتے تو اس غلطی کو باقی نہ رکھتے۔ اس طرح پوری مطبوعہ مثنوی میں متعدد غلطیاں اور اختلافات ہیں۔ اگر اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو تو انڈیا آفس کے نسخے یا ادارے کی اس نقل سے اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔'' [۸۵]

سید قدرت نقوی نے اپنے مضمون 'قطب مشتری' مطبوعہ قومی زبان، اگست ۱۹۸۸ء میں محی الدین قادری زور کے اس خیال کو سختی سے رَد کیا ہے۔ ان کے مطابق قادری صاحب کے تمام اعتراضات کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ مولوی صاحب کے مطبوعہ نسخے کو غیرا[؟] قرار دے کر اپنے مکتوبہ نسخے کی اہمیت جتائی جائے۔

''مولوی صاحب نے اپنے نسخے کو بنیاد نہیں بنایا بلکہ انڈیا آفس والے نسخے کو متن کی بنیاد قرار دیا۔ اس کا ثبوت اس عکس سے ملتا ہے جو اُنہوں نے شاملِ کتاب کیا ہے۔ عکس اور مطبوعہ میں شعری اختلاف بہت ہیں۔ نمایاں اختلاف یہ ہے کہ مخطوطے کے عکس میں عنوان 'آغاز داستان گوید' ہے جب کہ مطبوعہ میں عنوان 'مدح ابراہیم قطب شاہ گوید' ہے۔ یہ عنوان

انڈیا آفس کے نسخے میں ملتا ہے وہیں سے لیا گیا ہے۔ عکس میں عنوان سے پہلے یہ شعر ہے

قطب شہ توں وو کام کر اختیار
کہ رہے تا قیامت ترا یادگار

مگر مطبوعہ میں درج ذیل متن ہے جو انڈیا آفس والے نسخے سے منقول ہے

اتا قطب کی مدح کر اختیار
جو رہے یو قیامت تلک یادگار

یہی متن نصیر الدین ہاشمی نے 'یورپ میں دکھنی مخطوطات' میں دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کے پیش نظر مخطوطے کا عکس رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی اس کا موید ہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے انڈیا آفس کے نسخے کے عنوانات کے ابتدائی اور اختتامی اشعار دیئے ہیں۔ ان کا مقابلہ مطبوعہ سے کیا گیا تو وہ یکساں پائے گئے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ مولوی صاحب کے پاس انڈیا آفس کا نسخہ تھا۔'' [۸۶]

مولوی عبدالحق نے 'نصرتی' کے سال وفات کا تعین ۱۰۹۵ھ کیا تھا جب کہ نصیر الدین ہاشمی نے کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد کے اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست میں یہ ثابت کیا کہ نصرتی کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی تھی۔ کتب خانہ سالار جنگ میں نصرتی کی مثنوی 'گلشن عشق' کے آٹھ نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخے میں درج اس تاریخی قطعہ سے نصرتی کے ۱۰۸۵ھ میں انتقال کرنے کی تصدیق ہوتی ہے

بضرب شمشیر سوں یہ مینا چھوڑ جا کے جنت کے گھر میں خوش ہوا
سال تاریخ آ ملائک نے یو کہی نصرتی شہیدا ہے

''نصرتی شہیدا ہے'' سے ۱۰۸۵ اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ [۸۷]

۱۹۶۸ء میں 'معراج العاشقین کا مصنف' لکھ کر ڈاکٹر حفیظ قتیل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی 'معراج العاشقین' بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف نہیں بلکہ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی تصنیف ہے جو اُن کے رسالے 'تلاوت الوجود' کا خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس انکشاف کو پچھلے چالیس سالوں کا سب سے اہم تحقیقی انکشاف قرار دیا ہے [۸۸]۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل

نے مولوی عبدالحق کی مرتبہ 'معراج العاشقین' کے مطبوعہ متن میں بھی بے شمار اغلاط کی نشان دہی کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''مولوی صاحب نے اس رسالے کے متن پر غور نہیں فرمایا۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اُنھیں علم تصوف سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔'' [۸۹] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق کو قیاس آرائی پر مبنی قرار دیا ہے کیوں کہ انھوں نے تلاوت الوجود اور معراج العاشقین کا مفصل متن پیش نہیں کیا جس کے تقابلی مطالعے سے اختلافاتِ باہمی کا پتہ چل سکتا۔اس کے علاوہ ڈاکٹر حفیظ قتیل سے مخدوم شاہ حسینی کے صحیح زمانہ اور نسخے کے سنِ کتابت کا تعین کرنے میں بھی چوک ہوئی ہے۔[۹۰] (تفصیل کے لیے دیکھیے: ''معراج العاشقین کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' باب سوم، ص)

مذکورہ بالا سطور میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے مرتبہ ومدونہ متون پر اہل علم حضرات کے علمی اعتراضات اور اختلافات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو بابائے اُردو کے مرتبہ ومدونہ شعری ونثری متون پر سب سے زیادہ اعتراضات سنین کے تعین کے حوالے سے ہیں۔خواہ وہ کسی مصنف یا شاعر کے سال ولادت یا سال وفات کے تعین سے متعلق ہوں یا قطعات تاریخ سے، مذکور سال اخذ کرنا ہو یا کسی کتاب کا سال تصنیف متعین کرنا ہو، سنین کے تعین میں مولوی عبدالحق سے اکثر سہو ہوا ہے۔سنین کے تعین سے مولوی صاحب کو شاید طبعی رغبت بھی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے مدون کیے ہوئے اکثر متون میں مصنّفین کے سوانحی حالات کے بیان میں تشنگی محسوس ہوتی ہے مثلاً تاباں دہلوی، غضنفر حسین، میر اثر، انشااللہ خان انشاء وغیرہ۔

اسی طرح اگر کسی قدیم متن میں مصنف نے کوئی سنہ درج کر دیا ہے تو بابائے اُردو تحقیق کیے بغیر اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ مصنف نے اسے متن میں درج کیا ہے اور یہ داخلی شہادت ہے لہٰذا وہ کسی صورت غلط ہو ہی نہیں سکتی۔حالاں کہ تاریخی واقعات اور سوانحی حالات (کسی شاعر یا ادیب۔کے) لکھتے وقت سنین کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھنا لازمی ہوتا ہے اور جب تک ان کی صحت کی طرف سے مکمل اطمینان نہ ہو جائے متن میں ان کو درج نہیں کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ مولوی عبدالحق کسی کتاب کے سال تصنیف کے حوالے سے بات کرتے ہوئے صرف 'سال تکمیل' کا ذکر کرتے ہیں اور اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے کہ جس سال کتاب کی تکمیل ہوئی۔ یہ ضروری نہیں کہ مصنف نے کتاب لکھنا اسی سال شروع کیا ہو۔مولوی عبدالحق

کتاب کے سال آغاز کے تعین کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے۔ اگر مصنف نے خود دیباچہ میں یا قطعۂ تاریخ میں کتاب کے سال تکمیل کے ساتھ ساتھ آغاز کا سال بھی دے دیا ہو تو ٹھیک ہے ورنہ مولوی عبدالحق نے کسی کتاب کے سال آغاز کے تعین کے سلسلے میں کوئی تحقیقی کاوش نہیں کیا۔

بعض مقامات پر سنین کے تعین میں مولوی عبدالحق کے اپنے بیانات میں بہت واضح تضادات دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً 'ذکر میرؔ' کے مقدمے میں میر تقی میرؔ کا سال تصنیف مولوی عبدالحق نے ۱۱۹۷ھ متعین کیا لیکن انتخاب کلامِ میرؔ کے مقدمے میں لکھا کہ 'نکات الشعرا'، 'ذکر میرؔ' سے بہت بعد میں لکھی گئی اور نکات الشعراء کی داخلی شہادتوں سے اس کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح 'دریائے لطافت' کا سال تصنیف طبع اول (۱۹۱۶ء) میں ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۶ء لکھا اور طبع دوم (۱۹۳۵ء) میں ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۸ء لکھا جب کہ طبع دوم میں مترجم پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے دیباچے میں دریائے لطافت کا سنہ تصنیف انیسویں صدی کا آٹھواں برس قرار دیا ہے۔ طبع دوم میں یہ تینوں سنین ایک ساتھ موجود ہیں اور پُرلطف بات یہ ہے کہ مرتب، کاتب، پروف ریڈر وغیرہ کسی کی نظر میں یہ تضاد نہیں آیا۔ اسی طرح کا سہو بابائے اُردو سے 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے سلسلے میں ہوا۔ اس تذکرے میں ستانوے شعراء کا ذکر ہے لیکن بابائے اُردو سے متن کی عبارت کی تفہیم میں سہو ہوا اور انھوں نے پاکباز کے ذکر میں قزلباش کا بھی اضافہ کر دیا۔

مولوی عبدالحق کے مرتبہ و مدونہ متون میں اس قسم کی اغلاط کو ناقدین نے بابائے اُردو کی عجلت پسندی اور لاپرواہی پر محمول کیا۔ اس کا ایک سبب ان کی زندگی کی بے تحاشا مصروفیات کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے وہ بے لوث اور ان تھک کام کیا کرتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت انجمن کے تنظیمی کاموں، اُردو کی ترقی، ترویج اور مدافعت و مقابلے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ محکمہ تعلیمات اور ریاستی سرگرمیاں ان کے علاوہ تھیں۔ رشید حسن خان کے بقول انھوں (مولوی عبدالحق) نے نہایت اہم تذکروں اور قدیم متون کو شائع کیا اور اس طرح کام کرنے کا ڈول ڈالا کہ لوگوں کو ان امور سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن بات وہی ہے کہ

> "تحقیق شرک کو گوارا نہیں کرتی۔ آدمی اگر چومکھی لڑے گا تو اور موضوعات کا حق چاہے ادا ہو جائے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے جس انہماک، یک سوئی اور ڈوب جانے والی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہنگامہ آلود زندگی اس کے منافی ہے۔''[۹۱]

بابائے اُردو کے مرتبہ و مدونہ بیشتر متون میں ایک کمی جس کا شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان قلمی یا مطبوعہ نسخوں جن کو بنیاد بنا کر کسی شعری یا نثری متن کی تدوین کرتے ہیں، کا مکمل تعارف نہیں کرواتے کہ کس متن کو مدون کرتے وقت ان کے پاس کتنے نسخے تھے؟ وہ انھیں کس کتاب خانے سے کس شخص کی وساطت سے دستیاب ہوئے؟ ان کی کیفیت کیا ہے؟ یعنی وہ مکمل ہیں، نامکمل ہیں، ناقص ہیں، مخطوطے کا خط تحریر کیسا ہے؟ سائز کیا ہے؟ خاص طور پر یہ کہ اگر کسی متن کو مرتب کرتے ہوئے ان کے پاس دو یا تین نسخے ہیں اور ان میں سے کسی ایک نسخے کو وہ بنیاد بنا رہے ہیں تو یہ وضاحت نہیں کرتے کہ اس ایک نسخے میں ایسی کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر انھوں نے باقی نسخوں پر اس کو فوقیت دی۔

اکثر وہ نسخوں کے تعارف میں یہ لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ''میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں ان میں سب سے قدیم ۱۰۹۳ھ کا ہے یعنی تصنیف سے ۲۵ سال بعد کا۔'' (مقدمہ گلشنِ عشق، ص ۱۱) ''ہم نے یہ تذکرہ ایک مستند قلمی نسخے سے طبع کیا ہے جیسا کہ کتاب کے ترقیمے سے معلوم ہوگا۔ یہ سید عبدالولی عزلت کے لیے لکھا گیا تھا۔'' (مقدمہ، نکات الشعراء، ص ۸) ''یہ نسخہ تین قلمی نسخوں سے مرتب کیا گیا ہے ایک نسخہ جو سب سے ضخیم اور مکمل ہے وہ محترم پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا عطیہ ہے۔ دوسرا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی کا اور تیسرا انجمن کا۔'' (مقدمہ دیوان تاباں، ص د) ''مدت ہوئی مجھے 'سب رس' کے دو نسخے دستیاب ہوئے تھے ایک حیدر آباد میں، دوسرا بیجاپور میں۔ ان میں سے ایک تو بہ مقام دولت آباد ۱۱۱۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور دوسرا سنہ ۱۱۷۷ھ کا۔ یہ دونوں نسخے صاف لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دو اور نسخے ملے جو ایسے اچھے نہیں تھے اور ایک ان میں سے ناقص تھا۔'' (سب رس، مقدمہ، ص ۵۱)

مخزن نکات، انتخاب کلام میر اور انتخاب داغ میں تو انھوں نے سرے سے یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ انھوں نے کن نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی لکھتے ہیں:

> ''مخزن نکات کی روداد میں تو یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی روایت کو مولانا نے نہیں ایڈٹ کیا چناں چہ اس کی اشاعت اولی آخری صفحہ پر جو اندراجات تھے۔ انھیں دوسرا کاغذ چپکا کر قارئین کی نگاہوں سے چھپا دیا گیا تھا اور اس اشاعت کے نسخوں میں یہ صورت حال ملتی ہے۔''[۹۲]

بابائے اُردو کے مرتبہ و مدونہ چند متون (مخزن نکات، رانی کیتکی کی کہانی، لغت کبیر اُردو، دی اسٹنڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری) پر ایسے الزامات بھی عائد کیے گئے اور اس کا سب سے بڑا سبب ان کے مزاج کی مطلق العنانیت کو قرار دیا گیا۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: ''کہنے کو تو ڈاکٹر عبدالحق، انجمن ترقی اُردو کے معتمد تھے لیکن یہ کوئی راز نہیں کہ انھیں اس ادارے میں مرتبہ آمریت حاصل تھا۔ اشاعت کے لیے کون سی کتابیں منتخب ہوں گی۔ اگر کتاب پرانی ہے تو اس کی ترتیب وتہذیب کا فرض کون انجام دے گا۔ کس مطبع میں اور کس طرح چھپے گی، کاپی اور پروف کی تصحیح کس کے ذمے ہوگی۔ کتاب میں غلط نامہ شامل ہوگا یا نہیں۔ ان کل امور کا فیصلہ وہ بے شرکت غیرے کرتے تھے۔'' (عبدالحق بحثیت محقق، ص۲) لیکن رشید حسن خان کا خیال اس سے تھوڑا مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی کوتاہیوں کا اصل سبب مولوی صاحب کی مصروف اور ہنگامہ پرور زندگی تھی۔

> ''مولوی صاحب کے پاس اتنا وقت تھا ہی نہیں کہ وہ چھان بین کا حق ادا کرسکتے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ اکثر دوسروں سے بھی اپنے کام میں مدد لیا کرتے تھے لیکن کتابوں پر نام انہی کا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہو یا جھوٹ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جن متون پر ان کا نام بحثیت مدون درج ہے۔ ان میں آداب تدوین کی پابندی بہت کم نظر آتی ہے۔ یہی حال تحقیقی مقالات کا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ان کی تقلید میں تدوین اور تحقیق دونوں کو آسان کام سمجھا گیا۔'' [۹۳]

بابائے اُردو نے سب سے پہلے مستند متن کی تیاری کے لیے کسی ایک نسخے (قلمی یا مطبوعہ) کو بنیاد بنانے کی روایت کا آغاز کیا اور پھر ان کی تقلید میں رفتہ رفتہ یہی طریقۂ تدوین مروج ہوگیا۔ ایک نسخے کو بنیاد بنا کر متن تیار کرنا نسبتاً آسان ہے لیکن اس طریقۂ کار میں بے شمار قباحتیں ہیں دو مخطوطوں میں سے کسی ایک کو اہم تر یا اساسی نسخہ اس وقت تک قرار نہیں دینا چاہیے جب تک کہ نہایت واضح اور غیر مبہم شواہد دستیاب نہ ہوں۔ دوسری صورت میں غلطی کا سو فیصد امکان باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی نسخے میں اگر کتابت وغیرہ کی کوئی غلطیاں ہوں تو وہ بدستور باقی رہ جائیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے نسخے جن کو ثانوی درجہ دیا گیا ان میں بعض اصلاحات مصنف نے خود کی ہوں لیکن مذکورہ بالا طریقہ کار کی رُو سے انھیں متن کی بجائے حواشی

میں ہی جگہ ملے گی۔

گزشتہ ابواب میں اس امر پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے کہ مولوی عبدالحق اگر کسی نسخہ کو بنیادی یا اساسی نسخہ قرار دیتے تھے تو پھر اس کے لفظ لفظ کو ہی اصل حقیقت سمجھتے تھے۔ اگر اس کے متن میں کوئی لفظ غلط درج ہے تو اس لفظ کو جوں کا توں ہی متن میں لکھتے تھے اور دوسرے نسخے کا صحیح لفظ حواشی میں ہی جگہ پاتا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ مذکورہ متن کے مطالب کی صحت کی طرف وہ بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ حالاں کہ قدیم شعری ونثری متون میں مذکور حالات وواقعات کی معاصر تواریخ اور تذکروں کی مدد سے پرکھ تصحیح متن کا لازمی جزو ہے تا کہ ایک مستند متن جس میں تحریف نہ ہو۔ الحاقی مضامین نہ ہوں۔ اغلاط نہ ہوں اور یہ یقین بھی ہو کہ مذکورہ متن کا ہر حرف مذکورہ مصنف کے قلم سے ہی نکلا ہے، پیش کیا جا سکے لیکن مولوی عبدالحق اس انداز سے متن کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے مولوی عبدالحق مرتبہ و مدونہ متون میں بے شمار اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے معیاری تدوین کی بجائے اس بات پر زور دیا کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کے متن شائع کردیں اور اہل تحقیق و تدوین کے لیے خام مواد فراہم کردیں۔۔۔۔ اس طرح جو متن سامنے آیا اس میں ہر قسم کی اغلاط موجود ہیں۔'' [۹۴]

مولوی عبدالحق نے قدیم شعری ونثری متون مدون کرتے ہوئے حواشی میں اختلاف نسخ بھی درج کیے۔ ان کے مرتبہ اختلافات نسخ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جس طرح وہ نسخوں کا تعارف مبہم انداز میں کراتے ہیں اسی طرح اختلافات درج کرتے ہوئے یہ وضاحت نہیں کرتے کہ حواشی میں کس نسخے کے اختلافات درج کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نسخوں کے لیے مختلف نام یا علامات بھی متعین نہیں کرتے تا کہ وہ ایسے ایک دوسرے سے ممیز رہ سکیں۔

'جنگ نامہ سید عالم علی خان' کی تدوین کرتے ہوئے انھوں نے دستیاب نسخوں کو الف، ب، ج کے نام دیئے جن کی وجہ سے اختلاف نسخ کی تفہیم میں آسانی ہوگئی ہے۔ ان کے مرتبہ بعض متون میں حواشی اور اختلافات نسخ ایک دوسرے میں اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے دیکھنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔

'مخزن الشعراء' کی تدوین مولوی عبدالحق نے دو مختلف نسخوں کی مدد سے کی اور مقدمے

میں واضح الفاظ میں لکھا کہ ''ان دونوں کے مقابلے اور تصحیح کے بعد یہ نسخہ تیار کیا گیا ہے۔'' (مقدمہ مخزن الشعراء، ص ۸) لیکن مطبوعہ تذکرے کے متن ۔کے ساتھ اختلاف نسخ شامل نہیں ہیں اور نہ ہی تذکرے کے مطالعے سے کوئی ایسا سراغ ملتا ہے جس سے نشان دہی ہو کہ انھوں نے دو مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ مخزن شعراء کی تدوین کرتے ہوئے انھوں نے قیاسی تصحیح سے بھی کام لیا ہے لیکن انھوں نے تذکرے کے کس حصے کی، کس شعر کی یا کن الفاظ کی تصحیح کی ہے اور کہاں کہاں قیاس سے کام لیا ہے اس کی نشان دہی نہیں کی۔

مولوی عبدالحق مذکورہ متن کی کسی غلطی کی نشان دہی نہیں کرتے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مذکورہ متن کا ہر لفظ ہر قسم کی غلطی سے پاک ہے حالاں کہ مصحفی نے اپنے تذکروں میں بہت سے رطب و یابس اکٹھے کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ذکر میر کے بہت سے بیانات معاصر تواریخ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن بابائے اُردو نے ان متون کی تدوین کرتے ہوئے اس طرح کی کسی غلطی کی کوئی نشان دہی نہیں کی جس سے قاری اگر یہ سمجھے کہ مطبوعہ متون ہر قسم کے سقم سے پاک ہیں تو وہ حق بجانب ہوگا۔

مولوی عبدالحق کے مرتبہ و مدونہ متون کے مقدمات پڑھتے ہوئے اکثر جگہ خیالات کی تکرار کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال تو مصحفی کے تین تذکروں (عقد ثریا، تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا) کے متون کے ساتھ درج مولوی عبدالحق کا ایک ہی مقدمہ ہے۔ اس کے علاوہ تذکرہ نکات الشعراء کے مقدمے میں بھی تقریباً وہی مباحث مولوی عبدالحق نے پیش کیے ہیں جو 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے مقدمے میں زیر بحث آئے ہیں جس کی وجہ سے ان تحریروں پر دہرانے کے عمل کا اطلاق ہوتا ہے۔

جہاں تک قیاسی تصحیح کا تعلق ہے بابائے اُردو کے مرتبہ و مدونہ بیشتر متون میں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے لیکن اس حوالے سے خاص بات یہ ہے کہ بابائے اُردو کو اپنے علم اور حافظے پر اس قدر اعتماد اور یقین ہے کہ قیاسی تصحیح کرتے ہوئے انھوں نے کہیں یہ وضاحت کرنی ضروری نہیں سمجھی کہ انھوں نے کس لفظ کی یا کسی عبارت کی تصحیح کی ہے۔ یا تصحیح کرنے سے پہلے متن میں کون سا لفظ موجود تھا اور اسے کس لفظ سے بدلا ہے۔

ماہر محققین کا یہ کہنا ہے کہ مدون کو قیاسی تصحیح سے صرف اس وقت کام لینا چاہیے جب

اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے اور قیاس کے دائرے کو اس قدر وسیع نہ کیا جائے کہ متن مرتب کے قیاسات کا مجموعہ بن جائے لیکن بابائے اردو کے مرتبہ و مدونہ متون کا جائزہ لیتے ہوئے دکھائی دیتا ہے کہ انھیں اپنی صلاحیتوں پر کامل اعتماد ہے اور وہ پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ متن کے ان مقامات پر جہاں لفظ حذف ہیں یا کرم خوردہ ہیں یا عبارت مسخ ہے اپنے قیاس سے متن کی تصحیح کرتے ہیں۔

اکثر قدیم متون مدون کرتے ہوئے محققین جہاں متن کی عبارت مسخ ہو یا مبہم ہو وہاں قیاسی تصحیح کرنے کی بجائے سوالیہ نشان دے دیتے ہیں، نقطے بنا دیتے ہیں یا 'کذا' لکھ دیتے ہیں لیکن بابائے اردو نے بہت کم مقامات پر اس طریقۂ کار کی پیروی کی ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے قیاسی تصحیح کرتے ہیں اور کس لفظ کی تصحیح کی، کس لفظ کو بدل دیا، کس لفظ کو کاٹ کر نیا لفظ اضافہ کر دیا، اس کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتے۔

بحیثیت مرتب و مدون بابائے اردو کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ انھوں نے قدیم متون میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق حذف، اضافے اور ترامیم کی ہیں۔ حالاں کہ یہ بات تدوینِ متن کے اصولوں کے بالکل خلاف ہے۔ مرتب و مدون کا کام مصنف کے متن کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا ہے۔ اپنی پسند اور ترجیحات کے مطابق متن میں حذف و اضافے کرنا نہیں لیکن بابائے اردو نے بغیر کوئی جواز پیش کیے عقدِ ثریا (از مصحفی) میں سے مصحفی کا منتخب کیا ہوا اشعراء کا نمونہ کلام حذف کر دیا۔ ذکرِ میر (از میر تقی میر) میں سے فحش لطائف کو خارج کر دیا۔ دریائے لطافت (از انشاء اللہ خان انشاء) کے متن سے فحش کلمات حذف کر دیے۔ انشاء نے حروفِ تہجی کے لیے نئے اور منفرد نام تجویز کیے تھے۔ ان کو نکال کر متن میں مروجہ حروفِ تہجی شامل کر دیے۔ اس کے علاوہ دریائے لطافت کا دوسرا حصہ جو مرزا قتیل نے لکھا تھا اس کا عروض و قوافی کا حصہ متن سے خارج کر دیا۔ مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ''میں نے منطق اور عروض و قوافی کا بیان کتاب سے ترک کر دیا ہے کہ وہ کچھ مفید نہ تھا البتہ بیان و معانی کا بیان بطور نمونہ کے رہنے دیا ہے وہ کسی قدر ٹھیک ہے۔'' (دریائے لطافت، مقدمہ طبع اول، ص ن۔ص)

مصنف تو اپنی تصانیف کے لیے اس طرح کے فیصلے اور اقدام کر سکتا ہے لیکن ایک مرتب و مدون کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ دریائے لطافت کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۵ء جو کہ عام طور پر دستیاب ہے۔ اس 'دریائے لطافت' سے جو انشاء نے ۱۲۲۲ھ میں لکھی تھی

کافی حد تک مختلف ہو چکی ہے۔ انشاء نے دریائے لطافت کو جس منفرد انداز میں لکھا تھا جس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا تھا۔ آج جو دریائے لطافت ہماری دسترس میں ہے وہ نہ تو انشاء کے مقصد کو پورا کرتی ہے اور نہ ہی اس کے مخصوص اور منفرد انداز کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

قدیم متون کی تدوین کرتے ہوئے بابائے اُردو نے املاء کے سلسلے میں کسی خاص قاعدے کی پابندی نہیں کی۔ بعض متون میں انھوں نے مصنف متن کے قدیم املا کو متروک الفاظ سمیت برقرار رکھا کہ اس عہد کا مخصوص رنگ ابھر کر سامنے آسکے اور کہیں املا جدید دور کے مطابق ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق اکثر معلومات مرتب کرتے ہوئے اصل کتاب یا ماخذ سے رجوع کرنے کی بجائے اپنے حافظے پر انحصار کرتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر غلطیاں ہوتی ہیں۔ قاضی عبدالودود کا مولوی صاحب سے سب سے بڑا اختلاف اس بات پر تھا کہ وہ مستند حوالوں کے بغیر کوئی بھی بات کہہ دیتے ہیں مثلاً مصحفی کے دلی میں قیام اور پھر لکھنؤ جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ مصحفی نے دلی میں تھوڑے دن قیام کیا پھر لکھنؤ چلے گئے۔'' (عقد ثریا،ص ۱۰) جس پر قاضی عبدالودود نے معاصر تواریخ سے مستند حوالے نکال کر یہ ثابت کیا کہ ''یہ تھوڑے دن ۱۲ سالوں پر محیط ہیں۔'' (عبدالحق بحیثیت محقق،ص ۲۴۱) تحقیق ہر بات کے لیے مستند حوالہ مانگتی ہے۔ اگر محقق حوالہ پیش کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس کا سارا تحقیقی عمل باطل ہو جاتا ہے۔

قدیم متون کی تدوین کے بعد مقدمہ لکھتے ہوئے بابائے اُردو قدیم فارسی تواریخ، تذکروں، لغات دیگر کتابوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جیسے وہ یقیناً سب کے مطالعے میں ہوں گی۔ اس لیے وہ مذکورہ کتابوں کے مصنفین کا نام لکھنا اور ان کے موضوع کی نشان دہی کرنا بھی ضروری خیال نہیں کرتے۔ صرف اتنا ہی لکھتے ہیں: ''صاحب بساتین السلاطین'' لکھتے ہیں۔ ''لغت خاص خویش کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ ''مصنف تذکرۂ شعرائے دکن'' نے نصرتی کا نام محمد نصرت رکھا ہے۔ (مقدمہ گلشن عشق،ص ۲) چمنستان شعراء کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''شفیق کا تذکرہ میر صاحب اور فتح علی کے تذکروں سے بڑا ہے۔'' (ص ۵)

مولوی صاحب کے اس طرح کے بیانات سے تحقیق کا ایک نوآموز طالب علم یا ایک عام قاری جس کا فارسی تاریخ وادب کا مطالعہ چند کتب کے مطالعے تک محدود ہے بار بار رکتا ہے اپنے سامنے کئی سوالیہ نشان پاتا ہے۔

بابائے اُردو کے مدونہ اکثر متون پر یہ اعتراض بھی عائد کیا گیا کہ قدیم متون اور ان کے مصنفین کے متعلق مولوی عبدالحق کی بعض آراء غیر جانب دارانہ تنقید سے بہت دُور ہیں۔ ڈاکٹر تنویر علوی لکھتے ہیں:

''مولانا جیسے کسی محقق اور ادبی نقاد سے جہاں سلامت روی کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے اس کا جھکاؤ جنبہ داری اور سوگیری کی طرف ہے۔''
[۹۵]

مثلاً میر تقی میر کی درویشی اور شخصیت سے متعلق مولوی عبدالحق کی آراء، میر اثر کی خواب وخیال کو صف اول کی مثنوی قرار دینا، میر کی تنقیدی آراء کو حق گوئی قرار دینا، گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں کو نکات الشعراء کا جواب قرار دیتے ہوئے یہ کہنا کہ گردیزی نے جو زہر اُگلا ہے وہ دراصل میر کے خلاف ہے۔ مولوی عبدالحق کی اس طرح کی بعض آراء عدم توازن کا شکار نظر آتی ہیں۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے مرتبہ و مدونہ شعری ونثری متون پر کیے گئے مذکورہ بالا علمی اعتراضات واختلافات اپنی جگہ مبنی بر حقیقت ہیں لیکن ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک جن کی بدولت دو قسم کے نقطۂ نظر جنم لیتے ہیں۔ ایک ُرجائی ُ جو روشن پہلو کو دیکھتا ہے۔ دوسرا قنوطی جو تاریک پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ زندگی، علوم فنون اور تحقیق کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جہاں سب کچھ کامل و اکمل ہو۔ غلطیوں کی نشان دہی ضروری ہے کیوں کہ کسی کی غلطی پر سکوت اختیار کرنا اس غلطی کی اشاعت میں اعانت کے مترادف ہے لیکن دل آزاری ہر مذہب اور مشرب میں گناہ ہے لیکن زندگی میں اس سے مفر بھی نہیں اور تحقیق میں تو اس سے اجتناب ناممکنات میں سے ہے۔ اغلاط کی نشان دہی جس قدر محتاط انداز سے کی جائے آبگینوں کو ٹھیس ضرور لگتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ

''تحقیق میں اعتراض کرنے والے کو بیش از بیش دلداری اور اعتراض کے مخاطب کو زیادہ از زیاد بردباری اور وسیع القلبی سے کام لینا چاہیے۔'' [۹۶]

اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی دکھایا جائے۔ اغلاط شماری کے ساتھ خوبیاں بھی بیان کی جائیں خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ۔ تاکہ تصویر مکمل ہو سکے اور بات متوازن ہو سکے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے پچاس سال تک لگاتار اُردو تحقیق وتدوین کی خدمت کی، اُردو کی ادبی تاریخ میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے اتنی یکسوئی، لگن اور جنون کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی خدمت کی ہو۔ انھوں نے اپنے بے پایاں شوق و تجسس کے سہارے قدیم مخطوطات کی دریافت سے اُردو شعر وادب کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔ مولوی عبدالحق کو قدیم کلاسیکی متون سے خاص لگاؤ تھا۔ جو بھی قدیم مخطوطہ (شعری یا نثری) انھیں دستیاب ہوتا ان کی اولین کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ اسے جلد از جلد مرتب کر کے شائع کر دیں۔ اس لیے معترضین کا یہ کہنا ہے کہ معیار تدوین کی بجائے زیادہ سے زیادہ قدیم متون کی اشاعت ان کے پیش نظر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایک عجلت دکھائی دیتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ قدیم متون کو جلد از جلد تصحیح و ترتیب کے بعد شائع کرنے کی عجلت۔ اسی عجلت کی بنا پر مذکورہ متون میں اکثر اغلاط راہ پا گئیں لیکن ان کے مدون کیے ہوئے بیشتر متون اُردو تدوین کی روایت میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً سب رس، باغ و بہار، قطب مشتری، جنگ نامہ عالم علی خان، گل عجائب، چمنستان شعراء، انتخاب کلام میر، معراج العاشقین وغیرہ۔

ان متون کے ساتھ مولوی عبدالحق نے جو مقدمے لکھے وہ ان کی طرف سے انجام دیئے جانے والے کار تدوین کی ذیل میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ مقدمے تحقیقی و تنقیدی ہر دو اعتبار سے قابل قدر ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ”تفصیل اور جزئیات کو پیش کرتے ہوئے وہ تمام تحقیقی پہلوؤں کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن ان سے ملی جلی تنقید بھی ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ چناں چہ ان مقدمات میں انھوں نے تحقیق و تنقید کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے جن کتابوں پر وہ مقدمات لکھتے ہیں ان کی لسانی اور ادبی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے وہ تنقید سے بھی کام لیتے ہیں۔“ [۹۷]

قدیم متون یا ان کے مصنفین پر تبصرہ کرتے ہوئے صرف ان کی خوبیاں ہی بیان نہیں کرتے بلکہ خامیوں کی نشان دہی بھی غیر جانب دارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کو اس بات پر اعتراض تھا کہ مولوی عبدالحق نے میرؔ کی شخصیت و سیرت اور شاعری کی مدح سرائی مبالغہ آمیز انداز میں کی ہے جب کہ 'انتخاب کلام میرؔ' کے مقدمے میں مولوی صاحب نے واضح انداز میں لکھا کہ ”میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہے ورنہ ان کے ضخیم کلیات

میں رطب و یابس سب کچھ بھرا پڑا ہے۔" (مقدمہ انتخاب کلام میر، از مولوی عبدالحق، ص ۱۸)

اسی طرح ملا وجہی نے 'سب رس' اور 'قطب مشتری' کے دیباچوں میں اپنے شاعرانہ کمال کی بے حد تعریف کی جس سے متاثر ہوئے بغیر مولوی صاحب نے معروضی انداز میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا کہ "وجہی نے سارا قصہ شروع سے آخر تک فتاحی سے لیا اور کہیں اس کا اقرار نہیں کیا اور یہی نہیں بلکہ تحریر کا اُسلوب بھی اس سے اُڑا لیا ہے۔ یہ مانا کہ وہ فارسی میں ہے اور یہ دکنی میں۔ ایسی حالت میں وہ اخلاقی فرض یا انصاف جس کی تلقین وجہی نے اس طمطراق سے کی ہے کہاں باقی رہا۔" (سب رس، مقدمہ از مولوی عبدالحق، ص ۳۶)

ملا وجہی کی قطب مشتری کے زبان و بیان اور اُسلوب کی جہاں تعریف کی "وجہی کا کلام بہت سلیس، صاف اور ستھرا ہے۔" (مقدمہ، قطب مشتری، ص ۶) وہاں یہ بھی واضح کر دیا کہ "یہ مثنوی کوئی اعلیٰ پایہ کی نہیں ہے ہاں اس اعتبار سے کہ قدیم اور اس زمانے کا ایسا مرتب کلام کم ملتا ہے، قابل قدر ہے۔" (مقدمہ، قطب مشتری، ص ۳)

اسی طرح 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے مقدمے میں 'نکات الشعراء' اور 'تذکرہ ریختہ گویاں' کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: "گردیزی نے جس دعویٰ کے ساتھ اس تذکرے کے لکھنے کا قصد کیا تھا اس کا کتاب میں کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ اس میں کہیں غلط حالات کی تصحیح کی گئی ہے نہ مظلوم ہمسروں اور ہمعصروں کی بے جا خردہ گیری کا جواب دیا گیا ہے نہ ان نازک خیال رنگین شعراء کے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے جو دوسروں کی بے اعتنائی کا شکار ہوگئے۔" (مقدمہ، تذکرہ ریختہ گویاں، ص ۱۵)

مولوی عبدالحق نے جس عہد میں تدوین کی اس عہد میں سب سے توجہ ماخذ کا کھوج لگانے پر دی جاتی تھی۔ بابائے اُردو نے بھی قدیم متون کی تدوین کرتے ہوئے اصل ماخذ تک رسائی کو خاص اہمیت دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے نہ صرف متون کی داخلی شہادتوں سے مدد لی بلکہ معاصر عہد کی ادبی تاریخوں اور تذکروں سے بھی استفادہ کیا۔ 'سب رس' کی تدوین کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے یہ ثابت کیا کہ 'سب رس' کا قصہ ملا وجہی کا طبع زاد قصہ نہیں ہے بلکہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی پانچ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی 'دستور العشاق' کے نثری خلاصے 'حسن و دل' سے ماخوذ ہے۔ (مقدمہ، سب رس، از مولوی عبدالحق، ص ۶)

اسی طرح 'باغ و بہار' کے مقدمے میں مولوی عبدالحق نے پہلی بار اس حقیقت سے پردہ

اُٹھایا کہ باغ و بہار کا ماخذ دراصل 'نوطرز مرصع' ہے لیکن میر امن نے اپنے دیباچے میں کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا بعد میں حافظ محمود شیرانی اور بعض دوسرے لوگوں نے میر امن پر مولوی عبدالحق کے اس اعتراض کو غلط قرار دیا اور ثابت کیا کہ باغ و بہار کی اشاعت اول کے سرورق پر یہ صراحت موجود ہے لیکن ابھی تک یہ متحقق نہیں ہوا کہ وہ سرورق کتاب کے مصنف میر امن کا ہی لکھا ہوا ہے جب کہ مولوی عبدالحق کا اعتراض آج بھی اپنی جگہ برقرار ہے کہ میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ 'باغ و بہار' کا ماخذ 'نوطرز مرصع' ہے۔

میر امن نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں واضح الفاظ میں لکھا کہ باغ و بہار فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے اور فارسی قصے کو امیر خسرو سے منسوب کیا۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں میر امن کے اس بیان کی مدلل تردید کی اور ثابت کیا کہ باغ و بہار نہ تو فارسی قصے کا ترجمہ ہے اور نہ ہی امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ بعد میں (۱۹۳۹ء) حافظ محمود شیرانی نے اس موضوع پر تفصیلی مضمون لکھا لیکن اس حوالے سے اولیت مولوی صاحب کو ہی حاصل ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے، باب سوم، ص تا ص)

اُردو میں کسی شاعر کی پہلی خود نوشت سوانح (ذکر میر) کو بھی پہلے پہل مولوی عبدالحق نے اُردو دنیا سے متعارف کرایا، نکات الشعراء اور انتخاب کلام میر کی ترتیب و تدوین سے میر کی شخصیت، تنقید اور شاعری کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں کو نئے اور منفرد انداز سے پیش کر کے میر شناسی کی روایت کا آغاز کیا۔ کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی پہلی اُردو صرف ونحو کی کتاب دریائے لطافت (انشاء اللہ) کو اہل اُردو سے متعارف کرایا۔ 'جنگ نامہ عالم علی خان' مدون کر کے اُردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک نئے دکنی شاعر 'غفنفر حسین' کا اضافہ کیا اور ولیم آردن کی 'جنگ نامہ سید عالم علی خان' کے مصنف کے حوالے سے غلط فہمی کو بھی رفع کیا اور 'جنگ نامہ' کی اندرونی شہادت سے یہ ثابت کیا کہ یہ 'غفنفر حسین' کی تصنیف ہے۔ 'قطب مشتری' کے مقدمے میں پہلی بار مولوی عبدالحق نے اس امکان کو رَد کیا کہ قطب مشتری کی 'مشتری' درحقیقت بھاگ نگر کی 'بھاگ متی' ہے۔ لکھتے ہیں: ''ممکن ہے ایسا ہو لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا، مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں 'بھاگ متی' کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔'' (مقدمہ، قطب مشتری از مولوی عبدالحق، ص۲-۳) آنے والے دنوں میں ڈاکٹر سیدہ جعفر اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی نے اپنی تحقیقات کے ذریعے بھاگ متی کی رومانوی داستان کی تردید کی۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مولوی عبدالحق نے قدیم متون کی تدوین کرتے ہوئے اپنے مقدمات میں پہلے پہل جو تحقیقی نکتے بیان کیے یا تحقیقی مباحث چھیڑے جدید محققین نے انھی تحقیقی نکات پر اپنی تحقیقات کی عمارت کھڑی کی۔ سب رس اور باغ و بہار کے ماخذ کی بحث کے علاوہ معراج العاشقین کے مصنف کے حوالے سے بھی اختلافی مباحث کا آغاز مولوی عبدالحق نے ہی کیا۔ معراج العاشقین کے مقدمے میں مولوی عبدالحق نے کہیں بھی پورے یقین سے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اس کے مصنف خواجہ بندہ نواز گیسودراز ہی ہیں۔ اس نکتے کو پیش نظر رکھتے ہوئے نئے محققین نے تحقیق کی اور معراج العاشقین کا مصنف (ڈاکٹر حفیظ قتیل) جیسی کتب تخلیق کیں۔ 'نصرتی' پر مولوی صاحب نے ایک مستقل کتاب بھی لکھی اور اس کی مثنوی 'گلشن عشق' بھی مدون کی اور اس غلط فہمی کی بھی تردید کی کہ نصرتی 'برہمن' تھا۔ انھوں نے نصرتی کے کلام سے داخلی شہادت کی بنا پر یہ ثابت کیا کہ نصرتی نسلاً بعد نسل مسلمان تھا۔

مولوی عبدالحق نے تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا کہ صنوبر اور مدمالتی کی محبت پر مبنی قصہ جس پر نصرتی نے 'گلشن عشق' کی بنیاد رکھی اس زمانے میں دکن میں بے حد مقبول تھا۔ مقدمے میں انھوں نے ان مثنویوں اور نثری داستانوں کی فہرست بھی مرتب کی جن میں یہ عشقیہ قصہ بیان کیا گیا۔

اسی طرح 'دیوان تاباں' کی داخلی شہادت کی بنا پر تاباں دہلوی کے استاد کے حوالے سے اختلافی مباحث کو ایک نیا رُخ دیا اور یہ ثابت کیا کہ درحقیقت 'حشمت' تاباں کے استاد تھے۔ اس کے علاوہ دیوان تاباں میں الحاقی کلام کی نشان دہی بھی کی۔ 'دیوان اثر' کی تدوین کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نسخے کو بنیاد بنایا۔ ۴۸ سال بعد ڈاکٹر کامل قریشی نے اثر کا دیوان مرتب کیا تو انھوں نے بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نسخے کو ہی بنیاد بنایا حالاں کہ اس کے علاوہ ان کے پاس تین قلمی اور دو مطبوعہ نسخے مزید بھی موجود تھے۔

رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرے 'چمنستان شعراء' کی تدوین مولوی عبدالحق نے ایک قلمی نسخے کی مدد سے کی جو بے حد خستہ حالت میں تھا۔ اس کی تصحیح و ترتیب کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اصل ماخذات تک رسائی حاصل کی اور مختلف تذکروں، تواریخ اور شعراء کے دواوین سے نامکمل عبارتوں اور اشعار کو مکمل کیا۔ اس تذکرے کی تدوین میں انھوں نے افضل بیگ خاں قاقشال اورنگ آبادی کے تذکرے 'تحفۃ الشعراء' سے بھرپور استفادہ کیا اور ان شعراء کا

احوال اور نمونہ کلام جو شفیق کے تذکرے میں مذکور تھے حواشی میں درج کر دیا ہے اس کے علاوہ بعض ایسے شاعر جن کا ذکر شفیق نے 'چمنستان شعراء' میں نہیں کیا مولوی صاحب نے ان کا احوال ہر حرف کے آخر میں درج کر دیا ہے۔ اس طرح مولوی صاحب نے مزید دس شعراء (میر عبدالوہاب افتخار، محمد رضا قزلباش، مرزا علی نقی ایجاد، میر یوسف خان بسمل، آقا امین ایلچی وفا، میر عبدالحی وقار، نواب ذوالفقار الدولہ بہادر جنگ، موزوں میر فخر الدین اورنگ آبادی، نور الدین علی رنگین، مولوی محمد باقر شہید) کا 'چمنستان شعراء' میں اضافہ کر دیا ہے۔

'مخزن الشعراء' میں قاضی نور الدین حسین خاں رضوی فائق نے گجرات کے بارہویں اور تیرہویں صدی کے ۱۲۱ شعراء کا ذکر کیا ہے۔ بابائے اُردو کے نزدیک اس تذکرے میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اس میں گجرات کے قدیم شعراء کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کمی کو بابائے اُردو نے اس طرح پورا کیا کہ مقدمے میں خطۂ گجرات کی تاریخی و سیاسی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ گجرات کے قدیم شعراء مثلاً حضرت قطب عالم (۷۹۰ھ-۸۵۰ھ) حضرت شاہ عالم (۸۱۷ھ-۸۸۰ھ) شیخ بہا الدین باجن (و-۹۱۲ھ) سلطان شاہ غزنی (و-۹۲۲ھ) کے ہندی آمیز اُردو میں موجود اقوال اور شاہ عالم جیو گام دھنی (و-۹۷۲ھ) کا دیوان 'جواہر الاسرار ہندی' اور میاں خوب محمد چشتی (و-۱۰۲۳ھ) کی کتاب 'خود ترنگ' سید ہاشم علوی (و-۱۰۵۹ھ) کے اقوال جو قدیم اُردو میں ہیں کا اجمالی تعارف اور نمونہ کلام پیش کر کے اُردو ادب کی اہم خدمت سرانجام دی اور یہ بھی ثابت کیا کہ گجرات اُردو کے قدیم ترین مراکز میں خاص اہمیت کا حامل ہے اور یہاں کے شعراء اور نثر نگاروں نے اُردو کی ابتدائی نشو و نما کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

'گل عجائب' (از تمنا اورنگ آبادی) کا جو قلمی نسخہ مولوی عبدالحق کو دستیاب ہوا اس کا کاتب بہت غلط نویس تھا۔ اس کے علاوہ نسخہ بھی بہت قدیم اور خستہ و خراب حالت میں تھا۔ بعض شعراء کا احوال رقم تھا تو نمونہ کلام موجود نہیں تھا، بعض شعراء کا نمونہ کلام موجود تھا تو حالات محذوف تھے۔ اس کی تصحیح و ترتیب کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے دیگر دستیاب تذکروں سے مدد لی اور گل عجائب میں شامل شعراء اور ان کے حالات کی تصحیح و تعیین کی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولف تذکرہ اسد علی تمنا کے سوانحی حالات بھی گل عجائب کے داخلی شواہد سے مرتب کیے۔ گل عجائب میں تمنا نے اپنا ذکر نہیں کیا البتہ بعض شعراء کے تراجم میں ضمنی اور بالواسطہ طور پر تمنا کا ذکر آیا ہے۔ بابائے اُردو نے ایسے تمام حوالوں کی مقدمے میں مطبوعہ تذکرے کے صفحہ نمبر کے ساتھ نشان دہی کی ہے اور ان

کی مدد سے اسد علی تمنا کی سوانح حیات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش آج بھی اس حوالے سے کامیاب کہی جاسکتی ہے کیوں کہ 'گل عجائب' اور تمنا کے بارے میں ۱۹۳۶ء میں جو معلومات مولوی عبدالحق نے مرتب کی تھیں ان پر نئے محققین اور جدید تحقیق مزید کوئی اضافہ نہیں کرسکی۔

قائم کے تذکرے 'مخزن نکات' میں قائم نے اپنا کلام بے حد مختصر درج کیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے مختلف تذکروں میں درج قائم کے اشعار جمع کیے اور مقدمے میں ان کو درج کرکے اس کمی کو پورا کیا اور ایسے اشعار، نظموں اور مثنویوں کی بھی نشان دہی کی جو سودا اور قائم دونوں سے منسوب تھیں۔ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کے مقدمے میں مولوی صاحب نے دلائل سے ثابت کیا کہ نواب مرزا شوق نے اپنی مثنویاں 'خواب وخیال' سے متاثر ہوکر لکھیں۔ مولوی عبدالحق نے مقدمے میں نواب مرزا شوق کی مثنوی بہار عشق اور میر اثر کی خواب وخیال کے تقابلی مطالعے کے بعد دونوں مثنویوں کے ایسے اشعار نقل کیے جن میں خیال کے ساتھ الفاظ کی بھی مماثلت ہے۔ لکھتے ہیں: ''اگر دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر رکھ کر پڑھے جائیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ مرزا شوق نے 'خواب وخیال' ہی کو اپنا نمونہ بنایا اور اسی مثنوی پر سے انھیں اس قسم کی زبان لکھنے کا خیال پیدا ہوا کیوں کہ شوق کے زمانے میں لکھنؤ میں شاعری لفظوں کا گورکھ دھندہ ہو کے رہ گئی تھی اور تصنع اور تکلف انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔'' (مقدمہ، خواب وخیال از مولوی عبدالحق، ص ح)

اُردو زبان، اس کے آغاز وارتقاء اور مختلف مسائل اور معاملات سے مولوی عبدالحق کی غیر معمولی دلچسپی ان کے مرتبہ ومدونہ متون کے مقدمات میں مختلف رنگ میں ظاہر ہوئی ہے۔ وہ اُردو زبان اور اس کے لسانی پہلوؤں پر جگہ جگہ بعض بہت ہی بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ (گزشتہ سطور میں اس کا تفصیلی ذکر آچکا ہے) مثلاً نکات الشعراء کے مقدمے میں انھوں نے میر کے حوالے سے اُردو زبان کے ابتدائی نام 'ریختہ' پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُردو کے لیے 'زبان اُردوئے معلیٰ' کا لفظ بھی سب سے پہلے میر نے استعمال کیا (مقدمہ نکات الشعراء، ص ۳)۔ 'سب رس' کے مقدمے میں انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ وجہی شمالی ہند اور دکن کی زبان میں فرق کرتا ہے۔ ''یہ پہلا شخص ہے جو اس زبان کو زبان ہندوستان کہتا ہے اور یہ اشارہ کافی ہے اس امر کے لیے کہ یہ زبان کہاں سے آئی۔ یہی کتابیں ہیں جو زبان کے محقق اور مورخ کے لیے دلیل راہ کا کام دیتی ہیں۔'' (مقدمہ، سب رس، ص ۳۸)

'کہانی رانی کیتکی' کی زبان کو مولوی صاحب نے 'ہندوستانی' قرار دیا جسے اُردو والے بھی سمجھتے ہیں اور ہندی والے بھی۔ (مقدمہ، کہانی رانی کیتکی، ص ۴۵) مصحفی کے تذکرے (عقد ثریا، تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحا) کے لیے مولوی صاحب نے جو مقدمہ لکھا اس میں مصحفی کے حوالے سے یہ تحقیق کی کہ اُردو شعراء میں مصحفی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مصحفی نے تذکروں میں جن جن مقامات پر زبان کے لیے اُردو کا لفظ استعمال کیا ہے مقدمے میں مولوی عبدالحق نے ان سب مقامات کی نشان دہی کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''حضور کے حال میں ذکر کرتے ہیں کہ ایک روز شاہ جہاں آباد میں لطف علی خاں ناطق کے گھر پر مشاعرہ تھا۔ میر کی طرح غزل میں قافیے کے بعد ردیف 'اور' بہ معنی طرف تھی۔ بعضے فصحا نے اسے خلاف ''اُردو'' خیال کر کے اس کی پیروی نہ کی۔ نثار کے حال میں لکھتے ہیں کہ ادائے زبان اُردو، چناں چہ باید از زبانِ ندرت بیانش می شود، قہر کے تذکرے میں مرزا قتیل کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''او ہم باوصف فارسی گوئی دعوئے اُردو دانی ریختہ داشت'' اسی طرح مہجور کے حال میں لکھا ہے ''سر کتاب در زبان اُردوئے ریختہ شکر آمیختہ از خامہ فکرش رونق سواد پذیرفتہ۔'' (مقدمہ، عقد ثریا، ص ۱۸-۱۹)

اس کے علاوہ باغ و بہار کے دیباچے میں میر امن نے بھی اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء کا احوال رقم کیا ہے۔

اسی طرح 'دریائے لطافت' کو ایک ہندوستانی کی لکھی ہوئی پہلی اُردو قواعد قرار دیا۔ مقدمے میں انشاء کے حالات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے اور ان کے لسانی شعور کی وضاحت کرنے کے بعد انھوں نے جہاں اس کتاب کی اہمیت کی طرف اشارے کیے ہیں وہاں ان کا زبان کی مزاج دانی کا شعور بھی قابل دید ہے: ''سید انشاء اللہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی فارسی زبان کا تتبع چھوڑ کر اُردو زبان کی ہیئت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے تو وہاں بھی زبان کی حیثیت کو نہ بھولے، علاوہ اس کے الفاظ و محاورات کی تحقیق، بیگمات کی زبان اور ان کے محاورات، مختلف الفاظ کے تلفظ، مختلف فرقوں کے میل جول سے زبان پر جو اثر پڑا ان سب کو بڑے لطف سے ادا کیا ہے اور بعض بعض نکات ایسے بیان کیے ہیں جن کی قدر وہی کر سکتے ہیں جنہیں زبان کا ذوق ہے۔'' (مقدمہ دریائے لطافت، ص و)

اس مقدمے میں لسانی تحقیق کے ساتھ ساتھ مولوی عبدالحق کے لسانی شعور کی بھی عکاسی

ہوتی ہے اور یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ باباۓ اُردو مولوی عبدالحق اُردو زبان کے نہ صرف ایک بڑے محقق ہیں بلکہ زبان کے مزاج داں بھی ہیں۔

مذکورہ بالا طویل بحث کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولوی عبدالحق نے مخصوص ماحول میں محدود وسائل میں، بہت کم عرصے میں اتنی زیادہ تعداد میں دکنی ادب کے قدیم شعری و نثری متون کو تصحیح و ترتیب کے بعد شائع کر کے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی صدیوں کا اضافہ کیا انھوں نے نہ صرف تحقیق و تدوین کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کیا بلکہ دوسروں کو بھی اس کا احساس دلایا اور نئے کام کرنے والوں کے لیے خام مواد فراہم کر دیا۔ یقینی طور پر مولوی عبدالحق کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے اُردو تدوین کی تاریخ میں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: ''ڈاکٹر عبدالحق کے تحقیقی کارنامے''، مشمولہ ''نقد عبدالحق''، ڈاکٹر معین الرحمٰن (مرتب)، ص ۴۷۔

۲۔ رشید حسن خان: ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ''، ص ۱۹۔

۳۔ محمد حسین آزاد: ''آبِ حیات''، ص ۸۶۔

۴۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مولوی عبدالحق کا مضمون ''کلیات قلی قطب شاہ''، مطبوعہ رسالہ اُردو، ۱۹۲۲ء، ص ۱۲-۲۰۔

۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو کی ادبی تحقیق آزادی سے پہلے''، مشمولہ ''اُردو میں اُصولِ تحقیق''، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، جلد دوم، ص ۱۶۹۔

۶۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار: ''دو ہم آہنگ محقق''، مشمولہ ''قاضی عبدالودود کے تحقیقی وتنقیدی جائزے''، مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد، (دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۱ء) ص ۹۸۔

۷۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''تحقیق کا فن''، ص ۵۳۴۔

۸۔ قاضی عبدالودود: ''قاضی عبدالودود کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے'' مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد (دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۱ء) ص ۱۰۸-۱۰۹۔

۹۔ ڈاکٹر خلیق انجم: ''ادبی تحقیق اور حقائق''، مشمولہ ''ادبی اور لسانی تحقیق''، ص ۱۶۰۔

۱۰۔ ''قاضی عبدالودود کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے''، ص ۱۰۹۔

۱۱۔ رائے لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی: ''چمنستان شعرا''، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۴۹۵۔

☆ ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے واضح الفاظ میں سہوِ کتابت کے امکان کو رد کیا ہے۔ ''مولانا عبدالحق نے 'چمنستان شعرا' کے مقدمے میں شفیق اورنگ آبادی کا سنہ ولادت ۱۱۸۵ھ لکھا اور 'چمنستانِ شعرا' کو ۱۱۷۵ھ کی تالیف بتایا۔ ظاہر ہے کہ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس سنہ کو کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ 'مقدماتِ عبدالحق' میں بھی یہی سنہ لکھا گیا ہے۔ خود مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں اس

تذکرے کی تالیف ہوئی اس لیے صحیح سنہ ۱۱۷۵ھ ہے۔'' [ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی: ''دکن میں اُردو'' (اُردو مرکز، لاہور، ۱۹۵۲ء) ص ۳۴۴۔]

۱۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ص ۱۳۸۔

۱۳۔ ''مخزن نکات''، مرتبہ اقتدا حسن، مقدمہ، ص ۴۷-۴۸۔

۱۴۔ قیام الدین قائم: ''مخزن نکات'' مرتبہ مولوی عبدالحق، مقدمہ، ص ۴۔

۱۵۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی: ''دید و دریافت''، ص ۱۰۱۔

۱۶۔ مولانا امتیاز علی عرشی: ''مقدمۂ دستور الفصاحت''، مطبوعہ رام پور، ۱۹۴۳ء، ص ۵۰۔

۱۷۔ حکیم نثار احمد: ''سخنورانِ کاکوروی'' بحوالہ شہاب الدین ثاقب، ''بابائے اُردو مولوی عبدالحق۔ حیات اور علمی خدمات''، ص ۱۲۳۔

۱۸۔ مقدمہ، ص ۶۔

۱۹۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی: مقدمہ ''دستور الفصاحت''، ص ۵۹۔

۲۰۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''اُردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری''، ص ۱۱۶۔

۲۱۔ فتح علی حسینی گردیزی: ''تذکرہ ریختہ گویاں''، مرتبہ عبدالحق، ص ۱۷۔

۲۲۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر: ''بابائے اُردو بحیثیت محقق''، مطبوعہ، قومی زبان، ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۔

۲۳۔ ایضاً ص ۴۲۔

۲۴۔ ایضاً ص ۴۳۔

۲۵۔ ایضاً ص ۴۴۔

۲۶۔ افسر صدیقی، سید علی رضوی: ''مخطوطات انجمن ترقی اُردو''، جلد اول، (کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان ۱۹۶۵ء) ص ۱۳۲۔

۲۷، ۲۸۔ ایضاً ص ۱۳۲۔

۲۹۔ ڈاکٹر تنویر علوی: ''مولانا عبدالحق اور تحقیق و تدوین''، مشمولہ ''مولوی عبدالحق ادبی و لسانی خدمات''، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۱۵۹۔

۳۰۔ ایضاً ص ۱۶۰۔

۳۱۔ قاضی عبدالودود: ''عبدالحق بحیثیت محقق''، ص ۲۳۴۔

۳۲۔ ایضاً ص ۲۳۵۔

۳۳۔ ایضاً ص ۲۳۵۔

۳۴۔ ایضاً ص ۲۳۹۔

۳۵۔ ایضاً ص ۲۳۹۔

۳۶۔ ایضاً ص ۲۴۱۔

۳۷۔ ایضاً ص ۲۴۳۔

۳۸۔ ایضاً ص ۲۴۷۔

۳۹۔ ایضاً ص ۲۴۴۔

۴۰۔ مولانا امتیاز علی عرشی: مقدمہ، ''دستور الفصاحت''، ص ۸۴۔

۴۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''عبدالحق بحیثیت محقق''، ص ۲۴۷ تا ۲۴۹۔

۴۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''عبدالحق بحیثیت محقق''، ص ۲۳۹ تا ۲۴۰۔

۴۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ''ادبی تحقیق'' (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۳ء) ص ۳۰۳۔

۴۴۔ ایضاً ص ۳۰۶۔

۴۵۔ قاضی عبدالودود: ''عبدالحق بحیثیت محقق''، ص ۱۲۳-۱۲۶۔

۴۶۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: ''اُردو نثر کا آغاز وارتقاء ۱۹ویں صدی کے اوائل تک''، ص ۱۵۰۔

۴۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ''تاریخ ادب اُردو''، جلد اول، ص ۴۳۴۔

۴۸۔ ایضاً۔ ص ۴۳۴-۴۳۵۔

۴۹۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''ہندوستان میں اُردو تحقیق ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۷ء''، مشمولہ ''کھوج'' (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰ء) ص ۲۲۰۔

۵۰۔ ممتاز احمد: ''سب رس ایک طبع زاد تصنیف''، مشمولہ ''احوال ونقد وجہی''، مرتبہ حیات خان سیال، ص ۱۸۱-۱۸۵۔

۵۱۔ عزیز احمد: ''سب رس کے ماخذ اور مماثلات''، مشمولہ ''احوال نقد وجہی''، ص ۱۴۷ تا ۱۵۷۔

۵۲۔ حافظ محمود شیرانی: ''سب رس یعنی قصہ حسن ودل تصنیف ملا وجہی''، مشمولہ ''احوال ونقد وجہی''، ص ۸۱۔

۵۳۔ ڈاکٹر سہیل بخاری: ''سب رس کی زبان''، مشمولہ ''اسالیب نثر پر ایک نظر'' مرتبہ ضیاء الدین (دہلی، ادارہ فکر جدید، ۱۹۸۹ء) ص ۱۱۹-۱۲۰۔

۵۴۔ ایضاً ص ۱۲۴۔

۵۵۔ ایضاً ص ۱۲۶۔

۵۶۔ ڈاکٹر قدرت نقوی: ''سب رس کی تدوین''، مشمولہ مطالعہ عبدالحق، ص ۱۰۸۔

۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

i۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: ''انشاء اور رانی کیتکی کی کہانی''، مشمولہ ''تحقیق و تنقید''، ص ۹۲۔

ii۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو کی نثری داستانیں''، ص ۲۴۱-۲۵۰۔

iii۔ سید قدرت نقوی: ''مقدمہ، کہانی رانی کیتکی''، ص ۶-۲۴۔

۵۸۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''اُردو کی نثری داستانیں''، ص ۲۴۰-۲۵۰۔

۵۹۔ انشاء اللہ خاں انشاء ''کہانی رانی کیتکی''، مرتبہ مولوی عبدالحق، امتیاز علی عرشی، سید قدرت نقوی، مقدمہ از قدرت نقوی، ص ۲۴۔

۶۰۔ ڈاکٹر عابد پیشاوری، ''انشاء اللہ خاں انشاء''، ص ۴۴۶۔

۶۱۔ اکبر علی خان: ''نگارشات عرشی''، مشمولہ ''نذر عرشی''، ص ۴۱۔

۶۲۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اخلاقیات تحقیق''، مشمولہ کھوج، ص ۲۶-۲۷۔

۶۳۔ حافظ محمود شیرانی: ''مقالات شیرانی'' مرتبہ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ص

۶۴، ۶۵۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو کی نثری داستانیں''، ص ۱۷۱۔

۶۶۔ رشید حسن خان: ''مولوی عبدالحق مرحوم کی بعض تحریریں''، مشمولہ ''مولوی عبدالحق ادبی و لسانی خدمات''، جلد دوم، ص ۱۱۹۔

۶۷۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون، ''تحقیقی نوادر''، ص ۱۳۲، بحوالہ ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خان، ص ۵۳۔

۶۸۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی (مرتبہ) ''اُردو میں لسانیاتی تحقیق''، پیش لفظ، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ص ب، مطبوعہ ۱۹۷۱ء۔

۶۹۔ مولانا امتیاز علی عرشی: ''دستور الفصاحت''، تمہید، ص ۳۔

۷۰۔ انشاء اللہ خاں انشاء، ''دریائے لطافت''، مرتبہ مولوی عبدالحق، مترجم: عبدالرؤف عروج، آفتاب اکیڈمی اُردو بازار، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۵۳۔
۷۱۔ ایضاً ص ۱۵۹۔
۷۲۔ ایضاً ص ۱۵۵۔
۷۳۔ حبیب احمد صدیقی، ''اُردو کی ایک شرم ناک مثنوی 'خواب و خیال''' ، مطبوعہ نگار، پاکستان، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۴۔
۷۴۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، ص ۲۹۹-۳۰۰۔
۷۵۔ مجنوں گورکھپوری: ''نکات مجنوں''، ص ۱۰۱۔
۷۶۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، ص ۳۰۴ (جلد اول)۔
۷۷۔ کلیم الدین احمد: ''اُردو تنقید پر ایک نظر''، ادارہ فروغ اُردو، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۵-۱۲۶۔
۷۸۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اُردو مثنوی شمالی ہند میں''، ص ۲۹۶ (جلد اول)۔
۷۹۔ ایضاً ص ۲۹۷۔
۸۰۔ ایضاً ص ۳۰۰۔
۸۱۔ حبیب احمد صدیقی: ''اُردو کی ایک شرم ناک مثنوی خواب و خیال''، ص ۲۳۔
۸۲۔ ڈاکٹر فضل حق کامل قریشی (مرتبہ): ''دیوان اثر''، دیباچہ، ص ۱۹۔
۸۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: ''تاریخ ادب اُردو''، جلد دوم، ص ۳۸۴-۳۸۵۔
۸۴۔ ایضاً ص ۳۸۵۔
۸۵۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور: ''تذکرہ مخطوطات''، جلد سوم۔
۸۶۔ سید قدرت نقوی: ''قطب مشتری'' مطبوعہ 'قومی زبان'، اگست ۱۹۸۸ء۔
۸۷۔ نصیر الدین ہاشمی، ''کتب خانہ سالار جنگ کے اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست''، ص ۶۰۱۔
۸۸۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''کھوج''، ص ۲۲۰۔
۸۹۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل: ''معراج العاشقین کا مصنف''، ص ۵۔
۹۰۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ: ''دکنی نثر میں تحقیق کے مسائل''، مطبوعہ ''فکر و تحقیق'' (تدریس دکنی

ادب نمبر)، جنوری تا جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۹۔

۹۱۔ رشید حسن خان: ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ''، ص ۱۱۲۔

۹۲۔ ڈاکٹر تنویر علوی: ''مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین''، مشمولہ ''مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات''، ص ۱۵۹، جلد دوم۔

۹۳۔ رشید حسن خان: ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ''، ص ۱۱۳۔

۹۴۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر: ''بابائے اُردو بحیثیت محقق''، مطبوعہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ۴۱۔

۹۵۔ ڈاکٹر تنویر علوی: ''مولانا عبدالحق اور تحقیقی تدوین''، مشمولہ مولوی عبدالحق ادبی ولسانی خدمات، جلد دوم، ص ۱۵۷۔

۹۶۔ ڈاکٹر گیان چند جین: ''اخلاقیات تحقیق''، مشمولہ کھوج، ص ۱۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

۹۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''مقدمات عبدالحق''، (مرتبہ)، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۴ء۔